تنقید و تنقیح

مصنف

پروفیسر احمد سجاد

ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز ڈویژن، مرکز ادب و سائنس (تعلیمی و فلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ)

بریاتو، رانچی، جھارکھنڈ

جملہ حقوق محفوظ

نام : تنقید و تنقیح

مصنف : پروفیسر احمد سجاد

زیر اہتمام : ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز ڈویژن، مرکز ادب و سائنس (تعلیمی و فلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ)

اشاعت : ۲۰۱۵ء

کمپوزنگ : ارشاد احمد

صفحات : ۲۵۱

قیمت : ۲۵۰ روپے

تعداد : ۵۰۰

Title : Tanqeed-o-Tanqeeh

Authored by : Prof. Ahmad Sajjad

Year of Publication : 2015

Price : Rs- 250

ISBN No:

Publisher : Research and Publications

Division Markaz-e-Adab-o-Science,

Ranchi

تقسیم کار:۔

(۱) تاج بک ڈپو، مین روڈ، رانچی ۱

(۲) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

(۳) مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی

(۴) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی

(۵) ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز ڈویژن، مرکز ادب وسائنس، رانچی

فون: 09431359971,0651-2540534,2543838

ترتیب

پیش لفظ.....الف تا و

باب اول:۔تعمیری ادبی جہات.....۱ صفحہ نمبر

(۱)عصری ادبی منظر نامے میں تعمیری ادب کا رول..... ۲

(۲)تعمیری ادب کی رجائیت..... ۱۰

(۳)اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ..... ۲۴

(۴)اردو زبان وادب کا منظر نامہ..... ۳۳

(۵)تحریک اور جمود(تعمیری ادب کے تناظر میں)..... ۴۲

(۶)ہندوستانی ادبیات کی فکری وفنی بنیادیں..... ۵۰

(اردو،ہندی،انگریزی،سنسکرت اور تامل کے حوالے سے)

(۷)اردو زبان وادب کے فروغ وارتقا میں اسلامی تہذیب کا کردار ۵۶

(۸)ادب اور تحریک اسلامی..... ۸۷

(۹)اردو شاعری میں محنت کش عوام..... ۹۶

باب دوم:۔شخصیات.....۱۰۷

(۱)پروفیسر عبدالمغنی۔کچھ یادیں،چند باتیں..... ۱۰۸

(۲)مولانا ارتضاء الدین حاذق ضیائی سہسرامی۔ایک مرد قلندر..... ۱۲۴

(۳)ابوالمجاہد زاہد۔رنگ ونور کا شاعر..... ۱۴۳

(۴)عزیز بگھروی کی نعت کوئی قندیل حرم کی روشنی میں..... ۱۵۴

(۵)ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی۔ایک باکمال نعت گو..... ۱۵۸

(۶) فیضؔ کی شاعری میں جبلتی شعور ۱۶۴
(۷) افتخار راغبؔ ۔ایک البیلا فطری شاعر ۱۷۵
(۸) قرۃ العین حیدر ۔اردو فکشن کی ایک منفرد فنکار ۱۸۶
(۹) پروفیسر شارب ردولوی کا تنقیدی شعور ۱۹۳
(۱۰) ڈاکٹر مظفر حبیب کی تنقید نگاری ۲۰۵
(۱۱) جھارکھنڈ کے چند اہم فنکار ۲۱۴
(۱۲) جھارکھنڈ میں اردو نثر و شاعری کی سمت و رفتار ۱۹۶۰ء کے بعد ۲۱۹

باب سوم :۔تاثرات ۲۲۴

(۱) ادبیات محمود (دوم) پر ایک نظر ۲۲۵
(۲) آنکھ اور اردو شاعری ۲۲۸
(۳) نعت نبی کی نئی جہتیں ۲۳۴
(۴) ڈیڈسی ۔ایک تاثر ۲۳۷
(۵) قندیل رہبانی ۔ڈاکٹر مظفر عالم سہسرامی ۲۴۰
(۶) سوئے حرم ۔ایک مطالعہ ۲۴۱
(۶) جالوں کے سفر کا راہی ۔یوسف رازؔ ۲۴۴
(۷) تصانیف پروفیسر احمد سجاد ۲۴۹

پیش لفظ

پچھلی تین صدیوں میں مغرب نے اپنی مادی و عسکری ترقی اور معاشی و سیاسی برتری کی بدولت جہاں دنیا کو بہت کچھ دیا وہیں اس کی بہت سی بیش قیمت متاع سے محروم بھی کر دیا۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج دنیا کا جو ملک جتنا زیادہ "ترقی یافتہ" ہے اتنا ہی زیادہ ظلم و جبر، استحصال اور قتل و غارتگری کا سبب بھی ہے۔ مغربی فکر و نظر کا بنیادی نقص مادہ پرستی کے نتیجے میں اس کی جزو پرستی ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں ان "شکستہ بتوں" کے عجائب خانہ میں اگر جھانکیں تو ہمیں ڈارون کی ارتقائیت، میکیاویلی کی وطنیت، کارل مارکس کی اشتراکیت، فرائیڈ کی جنسیت، ایڈلر کی لاشعوریت، ینگ کی اساطیریت اور ژاں پال سارتر کے کی وجودیت وغیرہ کی لاشوں کے ڈھیر نظر آئیں گے۔

؎ وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

انہیں دو تین صدیوں میں مغرب نے اپنی عسکری قوت، تکنیکی ترقی، معاشی خوشحالی اور سیاسی پروپیگنڈے کے ذریعہ مشرق بلکہ تقریباً پوری دنیا کو اپنا یرغمال اور غلام بنالیا، اس لیے مشرق کے بعض ادیب و دانشور بھی ان سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ چنانچہ مشرقی ادبیات بشمول اردو میں بھی جزو پرستانہ ادبی نظریات کی ایک وبا چل پڑی مثلاً ادب برائے ادبیت، ترقی پسندیت، جدیدیت، لسانیت، تکثیریت اور اب تازہ ترین نجاتیت (بنام: آزادی، خودمختاری و کشادگی) ان میں

آخرالذکر کو بسا غنیمت کہا جا سکتا ہے کہ اس میں حق تک پہنچ کے، حصول نجات کی جستجو پائی جاتی ہے۔

؎ تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

اس صورت حال نے زندگی وادب کے تعمیری یا کلی نقطۂ نظر کو وقتی طور پر بڑا نقصان پہنچایا۔ انسانی تاریخ از آدم تا ایندم گواہ ہے کہ اس نے اس کرۂ ارضی پر جب اولین قدم رکھا تو اس وقت سے آج تک جبلت کے علاوہ وہ خود شعوری اور خدا پرستانہ کلی قدری شعور سے مالا مال رہا ہے۔ مگر اس جزو پرستانہ ہائے ہونے پوری انسانیت کو ''معلومات زدہ جہل مرکب'' میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ایک طرف بچیاں ماں کی کوکھ میں ماری جا رہی ہیں تو دوسری طرف عورتوں کی کوکھ کو کرایہ پر لے کر بے اولادی کا غم غلط کیا جا رہا ہے۔ انسانی اعضا کی چوری کے لیے اغوا کا ایک نیا ریکٹ شروع ہو گیا ہے۔ عورت، عورت سے اور مرد، مرد سے شادی رچا رہے ہیں۔ اس فکر و نظر کا فساد یہ بھی ہے کہ آج ساری دنیا میں تین بنیادی رشتوں کا بحران پیدا ہو گیا ہے یعنی: انسان اور خدا، انسان اور فطرت، انسان اور انسان کے مابین۔ ان تین بنیادی رشتوں کے بحران نے مزید تین انسانی رشتوں کے توازن کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے یعنی: مرد کا مرد سے، مرد کا عورت سے اور فرد کا اپنی ذات سے۔

؎ یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

زندگی کے اس کلی یا روحانی تعبیر کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے انسانی و اخلاقی

ہی نہیں کائناتی بحران بھی پیدا ہو گیا ہے۔گلوبل وارمنگ، اوزون کا سوراخ، کاربن ڈائی آکسائیڈ زہر کی فراوانی، فضا کی آلودگی اور صاف پانی کی شدید قلت وغیرہ آخر کیا ہیں؟ حیات و کائنات کے اس بحران پر متعدد مغربی دانشوروں اور تخلیق کاروں نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اسے "ہوش مندی کے انقطاع" اور روزموں نے اسے "وحشت و بربریت کی کامیابی" پر محمول کیا ہے۔

سے

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

اس کے برعکس کلی و تعمیری فکر ونظر نے " فی السلم کافۃ" کی وجہ سے جملہ شیطانی وساوس و غلبے سے انفرادی وسماجی دونوں سطحوں پر محفوظ و مامون رہنے کا نسخۂ شفا پیش کیا ہے اور کار حیات کو چند سالہ جہان فانی تک محدود رکھنے کے بجائے حقائق ابدی تک دراز کر دیا ہے۔یہاں آزادی کا مطلب مادر پدر آزاد ہونا نہیں ہے بلکہ ہر طرح کے فتنوں سے خود کو بچاتے ہوئے تسخیر کائنات تک کی راہ ہموار کرنی ہے۔کیونکہ بعض فتنے قتل سے بھی بدتر ہیں جن سے آج حیات انسانی نت نئے بحرانوں کا شکار ہے۔اسی لیے راہ حق کو یہاں نور وظلمت، معروف ومنکر، گناہ وثواب، تقویٰ وفجور، کلمہ طیبہ وکلمہ خبیثہ وغیرہ کے تضادات سے واضح کر کے ایک مکمل نظام حیات کو پیش کیا گیا ہے۔جہاں مسخ شدہ مذاہب کی تنگی اور خوش کن بشارتوں اور ہیبت ناک وذہنوں کی کوئی گنجائش نہیں۔کیونکہ آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ "لکم دینکم ولی دین، لااکراہ فی الدین اور لست علیھم بمصیطر" کے ساتھ امر بالمعروف و نھی عن المنکر "ضروری ہے۔اس لیے یہاں برتنے

احساس، جدید فکر، نادر تجربے اور نئے امکانات کے تخلیقی اظہار کی مصنوعی نہیں حقیقی آزادی میسر ہے۔

؎ بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اور

؎ میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

تعمیری ادب کی رجائیت

''حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب وغریب ہے۔اس کا تو ہر معاملہ اس کے حق میں سراپا خیر ہوتا ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔اس طرح اسے خوشی اور راحت پہنچے تو شکر ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف ومصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے سرتا سر خیر ہوتا ہے۔'' (کلام نبوت جلد دوم۔ مرتبہ محمد فاروق خاں۔مرکزی مکتبہ اسلامی طبع دوم مئی ۹۴ء بعنوان ''صبر ومصائب میں'' صفحہ ۲۵۸)

یا ''ان اللہ مع الصابرین'' جیسی دیگر احادیث وآیات اس امر کی شاہد ہیں کہ دینی وروحانی اقدار حیات نے دنیوی زندگی کو بالکل عارضی اور آنی وجانی قرار دیا ہے اور اصل زندگی حیات بعد ممات کی ہے، موجودہ زندگی عارضی ہی نہیں امتحان گاہ بھی ہے لہذا اس چند روزہ زندگی میں صبر وشکر ہی برتر اخلاق والوں کا وطیرہ ہوتا ہے۔صبر وشکر کی یہ فضیلت اسلام ہی تک محدود نہیں تمام آسمانی اور غیر آسمانی مذاہب کی قدر مشترک ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس قدر کے حاملین خواہ کسی مذہب وملت کے کیسے ہی ادیب وشاعر ہوں ان کی تخلیقات نظم ونثر میں یہ جوہر نمایاں ہوتا ہے۔حالانکہ انسانی سرشت اور نفسیات میں آلام ومصائب پر آہ وبکا، رنج وغم، ماتم ومرثیہ حتیٰ کہ شدت ملال میں خودکشی تک کے اقدامات کو بالکل غیر فطری نہیں کہا جاسکتا آئے دن اس طرح کے واقعات وحادثات رونما ہوتے رہتے

ہیں۔

نثری و شعری تخلیقات میں رنج و غم کے اظہار کے لیے مختلف زبانوں میں بعض مستقل صنفیں وجود پا چکی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کی صنف مرثیہ نگاری مشہور زمانہ ہے، اس کے علاوہ "شہر آشوب" اور دیگر طرز اظہار اس "قنوطی" ردعمل کا واضح ثبوت ہیں۔ چنانچہ دنیائے ادب و تخلیق میں "رجائی و قنوطی" دو مستقل رجحانات نمایاں ہیں۔ مگر ان دونوں طرز کے حوالے سے میرؔ و سوداؔ کے بارے میں یہ کہنا کہ ایک "شاعر آہ" تھے اور دوسرے "شاعر واہ" بڑی سطحی بات ہوگی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس رجائیت یا قنوطیت کا رنگ و آہنگ، تراش و خراش اور ہائے و ہو کی نوعیت اور انداز بیان کا اندرون کیسا ہے۔ بعض ادیب و شاعر بظاہر بڑے رجائی، پر جوش اور بلند بانگ ہوتے ہوئے بھی غور کریں تو بباطن بہت جلد ٹوٹ جانے اور بکھر جانے والے ہو سکتے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی تخلیقات اور ان کا پورا وجود اس کی بہترین مثال ہے انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف کیسی کیسی باغیانہ اور غضبناک نظمیں کہیں۔ ہندوستانیوں کی بے حسی و بے عملی اور غلامانہ ذہنیت پر کیسے کیسے شعری غیض و غضب کا اظہار کیا مگر عشرت کدے کی تلاش میں جب پاکستان پہنچے اور وہاں انہیں مایوسی و نامرادی ہاتھ آئی تو اپنی آپ بیتی اور خطوط میں خود کو جس طرح "زندہ در گور اور مرحوم" ثابت کرتے رہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جوشؔ کے برعکس اقبالؔ کے یہاں دور غلامی میں برطانوی استعمار اور مغربی ظلم و جور کے طوفانی تھپیڑوں میں بھی جس صبر و ثبات، حوصلہ و ولولہ اور مختلف مقامات پر غمناکی کے باوجود عزم بلند کا اظہار کیا گیا ہے اسے دنیائے شاعری میں "معجزۂ فن" قرار دیا گیا ہے۔

اقبالؔ و جوشؔ کی رجائیت کا یہ فرق تفصیلی تحقیق و تجزیہ کا موضوع ہے ہم یہاں اشارتاً یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اقبالؔ کے یہاں اسلامی فکر و فلسفہ، تاریخ و تہذیب اور انکی خاندانی روایت و تربیت کا جو گہرا اثر تھا وہ جوشؔ سے بالکل مختلف تھا یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ اپنی

والدہ مرحومہ کی یاد تازہ کر رہے ہوں یا ملت مظلومہ کا "شکوہ" کر رہے ہوں ان کے فکر وفن کی گہرائی و گیرائی اور اظہار غم والم میں بھی جو ضبط اور بلند آہنگی ہے وہ دنیائے شعر وادب میں خاصے کی چیز ہے۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اقبال کی لافانی نظموں میں شمار ہوتی ہے جس میں شاعر نے موت وحیات، درد وغم، وقت اور مرہم اور روز وشب وغیرہ کے استعاروں اور علامتوں میں اپنے دینی واخلاقی نقطہ نظر سے سیراب فکر وفن کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔

شاعر کو اپنی ماں کی موت کا شدید غم ہے جسے وہ زندگی کے ایک لازمہ مجبوری سے تعبیر کرتے ہوئے دنیا کو ایک طرح سے "ماتم خانہ" قرار دیا ہے جہاں ہر جگہ "موت کی ارزانی" نظر آتی ہے۔ مگر "دیدۂ قدرت" میں زندگی ایسی محبوب ہے کہ ہر چیز کی فطرت میں "ذوق حفظ زندگی" ودیعت کر دی گئی ہے اس لیے موت کے ہاتھوں نقش حیات کے مٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس کی مثال انسانی زندگی میں بس نیند کی سی ہے۔ شاعر نے جابجا غم والم کی جذباتی کیفیات کو بڑے صبر وسکون کے ساتھ "ہوا اور اسکی حباب سازی، مرمر کے جینے" کی حسین استعاراتی مثالیں دیتے ہوئے اس "شعلۂ حیات کو شراروں اور ستاروں سے زیادہ پائیدار" بتایا ہے اور واضح کیا ہے کہ "تخم گل زیر خاک" ہو کر بھی "خود نمائی وخود فزائی کے لیے بیتاب" رہتا ہے۔ بقول شاعر

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اقبال کے قلب حساس، وسعت مطالعہ اور اسلامی فکر ونظر نے موت کے پردے سے بھی زندگی کے روئے تاباں کو اس حسین اور مؤثر انداز میں ابھار دیا ہے کہ اسکی مثال دنیائے شاعری میں شاذ ونادر ہی پیش کی جا سکتی ہے۔

اگر غور کریں تو پورے اردو ادب اور شعری سرمائے میں اسلام ہی نہیں مختلف بڑے مذاہب کی بنیادی قدروں کی چھاپ انمٹ ہے، یہی وجہ ہے کہ بلا تفریق مذہب

وملت اردو شعرا نے دنیوی زندگی کے آنی و جانی ہونے اور اخروی زندگی کی ابدیت پر زور دیتے ہوئے مثبت اخلاقی قدروں پر بطور خاص زور دیا ہے۔ میرؔ وفاؔنی کی غمنا کی والمنا کی ہو یا نظیرؔ و سوداؔ اور غالبؔ وغیرہ کی بے نیازی و سرمستی و سرفرازی، لاشعوری طور پر ان کی مثبت ورجائی اقدار کو ہر جگہ جاری و ساری محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کی زندگی پر سرسری نظر ڈالیے تو دولت مغلیہ کے ذریعہ سرافرازی، غدر کی قیامت خیزی، عارف کی جواں مرگی، ظالم انگریزوں کے در کی کاسہ گدائی اور صعوبت زندانی کے باوجود ان کی خلفشار خیز شاعری اور یہ مشہور شعر:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

اس کے برعکس ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ کے برے بھلے اثرات نے چونکہ دینی و اخلاقی اقدار حیات کو دھندلا دیا اس لیے مذکورہ جدید تہذیبی انتشار اور مغربی اثرات نے ہمارے ادب کو ماتم و مرثیہ اور قنوطی احساسات و جذبات سے بھر دیا۔ وہ رجائی انداز باقی نہیں رہا بلکہ اگر کہیں اس کا اظہار بھی ہوا ہے تو اس میں سطحیت اور کھلنڈرے پن کا احساس نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ البتہ دور حاضر میں بھی اردو کے شعری و نثری تخلیق کار کا سواد اعظم مذہبیات، مشرقی روایات اور دینی و اخلاقی اقدار حیات کے حوالے ہی سے اپنی نگارشات منظر عام پر لا رہا ہے۔ ان کی اکثریت چونکہ کسی سکہ بند ادبی تنظیم، گروہ یا انجمن سے وابستہ نہیں اس لیے ان کی تخلیقات گروہی ناقدین و محققین کی توجہ کا مرکز نہیں بن پاتیں۔

اس سلسلے میں اقبالؔ کے فکر و خیال اور تخلیقات کی حیثیت کو رول ماڈل کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اقبالؔ کی پوری شاعری اول تا آخر رجائی شاعری کا ایک پیکر حسین ہے۔ جس کا نقطۂ عروج ''تصور خودی'' ہے۔ جسے خود اقبالؔ اسلامی فکر و نظر کا حاصل خیال کرتے تھے۔ ان کی پوری شاعری سے قطع نظر صرف ''فنون لطیفہ'' کے ذیل کی نظموں کا اگر سرسری مطالعہ

بھی کیا جائے تو ان کی رجائی شاعری کے بیشتر رموز و اسرار واشگاف ہو سکتے ہیں۔ علامہ کے خیال میں ''خودی'' سے بیگانہ ادب و دین کی حامل امتیں زیر فلک رسوا ہوتی ہیں جن کی فکر تازہ سے جہان تازہ کی نمود ہوتی ہے، مایوسی و پژمردگی یا تقلید و کہنگی کی سنگ و خشت سے ایسے جہان کا ظہور ممکن نہیں اسی لیے وہ اپنے حریم دل میں غیر کی خودی پر اظہار حیرت ہی نہیں اسے کاروبار لات و منات قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اقبال تعمیری خودی کے بغیر ہر ہنر، صورت گری، شاعری اور جملہ فنون کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ اسے اگر کافری نہیں تو کافری سے کم بھی نہیں خیال کرتے ہیں، یہی بلند نگہی اور تعمیر خودی نظر میں گہرائی و گیرائی پیدا کرتی ہے جس سے شئے کی حقیقت واشگاف ہوتی ہے اور زمین پر رہتے ہوئے بھی آسمان سے رشتہ بحال رہتا ہے اور ایسا فنکار ''افکار و تخیل'' کا گداگر نہیں ہوتا۔ وہ عہد حاضر کے ہندی و عجمی فنکاروں کے مرگ تخیل پر افسوس کرتے ہیں کہ مشرق کا سر دراز لی رکھتے ہوئے بھی وہ فکری گداگری کے شکار ہیں۔ اس ضمن میں علامہ ایک فکر انگیز مگر نہایت حسین مثال فوارہ اور آبجو کے تضاد کے ذریعہ پیش کرتے ہیں کہ آبجو تو خاک میں سرنگوں ہو کر رواں ہوتا ہے مگر اس کے برعکس ع ''بلند زور دروں سے ہے فوارہ''۔ اقبال کے نظریۂ جمال کی رو سے جلال کے بغیر ہر حسن و جمال بے تاثیر ہے لہذا وہ ''نفس گرم اور نغمۂ آتشناک'' کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر کسی نوا میں موت کا پیغام پوشیدہ ہو تو انکی نگاہ میں ایسے تمام نائے و چنگ و رباب، حرام ہیں۔ اس لیے افسردہ نوائی کے مقابلے میں شاعر مشرق کوہ شکنی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں اسی لیے موصوف ہنروران ہند اور یہاں کے شاعر و صورت گروں اور افسانہ نویسوں پر یہ کہہ کے طنز کرتے ہیں کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے کیونکہ غفلت و کم نگہی، تقلید جامد یا غلامانہ ذہنیت کے سبب وہ روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرنے کا شیطانی عمل جاری رکھنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں ''چشم آدم سے اس کے مقامات بلند کو چھپا کر رکھ دیتے ہیں''۔ لہذا وہ ہر فنکار کو اپنی قدروں سے جڑ کے محنت شاقہ کے ساتھ نئی نئی

دنیاؤں کی تلاش کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ معاملہ "میخانۂ حافظ" کا ہو یا "بتخانۂ بہزاد" بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا۔ اور خانۂ فرہاد بھی شرر تیشہ ہی سے روشن ہوتا ہے۔

اقبالؔ نے مغرب کے اندھے مقلدین ہی نہیں، تنگ نظر ملاؤں کو بھی ان کی کور نگہی پر نہیں بخشا ہے: ع زجاج گر کی دوکاں شاعری ملائی

اقبالؔ شاعری کو نغمۂ جبریل یا بانگ سرافیل اسی وقت تسلیم کرتے ہیں جب وہ حیات ابدی کے پیغام کی حامل ہو۔ اسی لیے وہ رقص بدن کے بجائے رقص ضرب کلیم الٰہی کو ترجیح دیتے ہیں کہ اسکا صلہ درویشی و شاہنشاہی کی شکل میں ملتا ہے۔

کلام اقبالؔ کی یہ بلند آہنگی اور رجائی طرز اظہار کی معراج اصلاً ان کے مخصوص مزاج و ماحول اور تعلیم و تربیت کی روح میں پوشیدہ ہے جس کی اساس ان کا ایمان باللہ، حدود اللہ کا شعور اور عمل صالح کے حقائق سے آگہی و باخبری پر استوار ہے۔ وہ اسلامی معروفات و منکرات، صبر و استقامت، جہد و عمل اور اطاعت الٰہی کو ہر طرح کے صلاح وفلاح کی کلید مانتے تھے۔ جس سے وہ عمر بھر مطمئن و سرفراز اور روحانی سرور و طمانیت سے سرشار رہے۔ ان کوائف نے انہیں طرز اظہار میں بے خوف و بیباک، وسیع النظر اور مثبت و رجائی بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان معروفات کے منکرین و منافقین پر طنز و استہزا ہی نہیں ضرب کلیمی سے بھی کبھی نہیں چوکے لیکن اپنے اردو فارسی کلام میں مختلف ادیان و نظریات کی تاریخ ساز شخصیات کے مثبت و معروف عمل کے معترف بھی رہے، اس لیے اگر وہ اپنے آخری نبیؐ، عمرؓ و علیؓ و حسینؓ اور حضرت نظام الدینؒ کے براہیمی عمل کی ستائش کی ہے تو زندگانیٔ رام، نانک، مسولینی، منصور حلاج اور سرمد و شکسپیئر کے بعض مثبت پہلوؤں کا اعتراف بھی کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تعمیری ادبی تاریخ میں اقبالؔ کی رجائی شاعری ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے اور بے شک وہ اپنی مثال آپ تھے اس حقیقت کے باوجود دنیائے

ادب وشاعری میں بلاتفریق مذہب وملت جن فنکاروں نے اپنے ایمان وعقیدہ اور مثبت و معروف نظریات وروایات پر خود کو عامل رکھا۔ انہیں کی تخلیق آج بھی عظیم وجلیل مانی جاتی ہے۔ سعدیؔ وحافظؔ اور رومیؔ وحالیؔ کی طرح تلسی وکبیر، شیکسپیئر وایلیٹ اور بھرتری ہری وٹالسٹائی کی تخلیقات بھی حزن والم کی بعض کیفیات کے اظہار کے باوجود بحیثیت مجموعی ان سب کا اصل تخلیقی جوہر رجائی رہا ہے۔ اسی لیے اس میں آفاقی کشش وتاثیر بھی پائی جاتی ہے۔

اقبالؔ کی طرح ایمان وروحانی اقدار کے حامل کسی بھی فنکار کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو فنی وتخلیقی مقام ومرتبے میں حسب صلاحیت فرق تو ضرور واقع ہوگا مگر رجائی پہلو بہر حال نمایاں ہوگا بطور عملی مثال اسی فکر ونظر کے دو شعرا حفیظؔ میرٹھی اور ابوالمجاہد زاہدؔ کی شاعری کا اگر سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو مذکور بالا حقائق کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں شعرا کی انفرادی وخاندانی زندگی غم وآلام سے محفوظ تھی۔ یہ دونوں سماجی وسیاسی تہلکوں، قبل وبعد آزادی کی قتل وغارتگری، تقسیم ملک کی کربناکی اور آخر وقت تک نجی مسائل سے پریشان بھی رہے۔

حفیظؔ میرٹھی ایمرجنسی کے زمانے میں بلاوجہ جیل بھیج گئے۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ان کا اکلوتا بیٹا اللہ کو پیارا ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے ایک رشتہ دار نے ان کی اہلیہ محترمہ کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ ان سانحات کے باوجود ان کی شان بے نیازی حیرت انگیز ہے۔

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

یہ دردانگیز چین وسکون قارئین کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غم وآلام اور صبر وسکون کے سلسلے میں دینی واخلاقی تعلیمات اور سیر وآثار سے حفیظؔ جیسے فنکار کا جو مزاج بنا اس کی عکاسی ملاحظہ ہو:

غم بھی اک احسان ہے اس کا، شکر کر اے دل شکوہ کیا
غم تو ہماری روح رواں ہے، ہم نہیں غم کے ماروں میں

اور یہ بانکپن بھی قابل دید ہے

یہ بانکپن ہے ہمارا کہ ظلم پر ہم نے بجائے نالہ فریاد شاعری کی ہے

یہ وہی حفیظ ہیں جنہوں نے بہت قبل اپنے درد دل اور شکستہ قلبی کا تخلیقی اظہار اس طرح کیا کہ وہ مشہور زمانہ ہو گئے

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے دل ٹوٹے آواز نہ آئے

دراصل حفیظ میرٹھی جیسے صاحب ایمان و کردار شاعر اپنے اعلیٰ و ارفع مقصد حیات اور رضائے الٰہی کے حصول میں چار حالتوں سے گزرتے ہیں تب جا کے کہیں یہ قطرہ گہر بنتا ہے۔ اولاً ان کا ایمان و عرفان انہیں اپنے نفس کے خلاف لڑنے اور احتساب کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تو دوسری طرف ناسازگار ماحول کی زہرناکی کے خلاف انہیں آمادۂ پیکار کرتا ہے۔ اور تیسری طرف باطل افکار و نظریات کے پھیلائے ہوئے فساد سے بھی مسلسل جنگ کرنی پڑتی ہے مگر اس جہد مسلسل میں مرد خدا کا جوش عشق، توازن اور ہوش کا پابند ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کسی تشدد یا انتہا پسندی کی گنجائش نہیں رہتی۔ بلکہ راہ حق کے مسافروں کو برسر اقتدار حکمرانوں، وقت کے فرعونوں اور ظالم قوموں کے ظلم و ستم کا شکار ہونا پڑتا ہے مگر ان جاں گسل حالات میں بھی مرد خدا کبھی ہمت نہیں ہارتا بلکہ اسکی "مظلومیت" بھی ایک قوت بن جاتی ہے اور پھر زمین تا آسمان وہ رحمت ایزدی کا مستحق بن جاتا ہے۔ غار ثور میں کبوتر گھونسلہ بنا لیتی ہے اور مکڑیاں جالے تن دیتی ہیں۔ اور اطمینان قلب کا یہ حال ہوتا ہے کہ وقت کا سب سے مظلوم و مقہور قائد پورے وثوق سے اپنے ساتھی کو ڈھارس دیتا ہے کہ لاتحزن ان اللہ معنا (گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے) مقصد حیات کا مکمل شعور اور خدائے بزرگ و برتر کی رحیمی و کریمی پر یقین کامل ایسے موقعوں پر اسے عالم بے خودی میں

پہنچا دیتا ہے۔

؎ باخبر تھے عشق کے انجام سے عشق کے انجام پر پچھتائیں کیا

؎ عشق نہ جب تک روح رواں ہو دل بھی ہے بیکار، نظر بھی

ایسے ہی صاحب نظر اور عشق و مستی کے متوالے زہر سے کس طرح تریاق کشید کرتے ہیں آپ بھی دیکھیں۔

؎ بربادیاں بھی عشق میں بےفائدہ نہیں اب آس پاس اہل ہوس کا پتہ نہیں

ایسے ہی صاحب نظر اپنے خالی ہاتھ رہ جانے کی بھی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ

؎ دست ہوس میں سیف ہے جہل کے ہاتھ میں قلم
معرکۂ حیات میں رہ گئے خالی ہاتھ ہم

ایسے خوفناک ماحول میں بھی جیالے اپنا راستہ بنا ہی لیتے ہیں

؎ اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کر جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

حفیظ میرٹھی جیسے مثبت اور رجائی فکر و نظر کے حامل تخلیق کار اپنے عشق و سرمستی کی وجہ سے متقی اور باطل قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور جہد مسلسل پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان مثبت اقدار سے ان کی تخلیقات میں حرکی عناصر کا ایسا اضافہ ہو جاتا ہے کہ قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اقبالؔ کا مشہور شعر ہے

؎ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

حق و باطل کے درمیان یہ تصادم ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔ اس ازلی تصادم کا حرکی عنصر اپنے غایتی میلان کی وجہ سے معنویت کی نئی نئی جہتوں اور سمتوں کو کھولتا چلا جاتا ہے اور اپنے جمالیاتی طرز اظہار کی وجہ سے قارئین کے لیے مسرت و بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے حق پرستانہ مقصدیت کو عریاں الفاظ میں براہ راست اور

واشگاف انداز میں پیش کرنے کے بجائے اسے اردو غزل کی مستحکم کلاسیکی روایات کے مطابق اسکی شیو دبیانیوں اور دل فریبیوں کو لباس حریر میں پیش کرتے ہیں۔

؎ یہ کمال سادگی ہے کہ مقام بے نیازی
مرا کھیل سنگ باری، مرا کام شیشہ سازی

؎ تمہاری یاد نے روشن کیے ہیں دل میں چراغ
تمہارے ذکر سے خوشبو دہن میں آئی ہے

اب حفیظ کی پسند اور ترجیح کی گراں قدری کا انداز کیجئے:۔

؎ شاعری اک درد بھی ہے، درد کا پیغام بھی یہ تڑپنے اور تڑپانے کا فن اچھا لگا

یہ رجائی انداز نظر فنکار کو ایسی بلندی اور طرفگی عطا کرتا ہے کہ اہل ہوس کی فریب کاریوں کا نہ صرف یہ کہ بڑے حسین انداز میں پردہ فاش ہو جاتا ہے بلکہ ایک مخصوص طرز کے طنز و طعن کو ایک بامعنی رخ بھی مل جاتا ہے۔

ہر ظالم سے ٹکر لی ہے سچے فنکاروں نے حفیظ ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہدیں "ہم ہیں تابعداروں میں"

دب کے رہنا ہمیں نہیں منظور ظالمو، جاؤ اپنا کام کرو
تم بھی دربار میں حاضری دو حفیظ پھر رہے ہو کہاں مظلوں کی طرح
سمٹے بیٹھے ہو کیوں بزدلوں کی طرح آؤ میدان میں غازیوں کی طرح

شاعر کے نزدیک درباری قباؤں سے بہتر تو کفن ہے۔ وہ تعمیر جہاں کا حوصلہ رکھتا ہے اس لیے تہذیب نو کی کافرادائی اور انسانیت کشی پر ماتم کناں ہے۔ موجودہ ادبی معیار و اقدار کی پستی پر بھی وہ اظہار تاسف کرتا ہے، اس کے نزدیک تقریر و تحریر کے مقابلے میں انسانی کردار کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے۔

تقریر سے ممکن ہے تحریر سے ممکن وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

حفیظ میرٹھی کی طرح تعمیری ادبی شاعری کے دوسرے سرخیل ابوالمجاہد زاہد سے

اردو دنیا خوب واقف ہے۔ بظاہر منحنی سے مسائل سے گھرے ہوئے مگر شگفتہ مزاج اور زندہ دلی کے پیکر سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ''تگ وتاز'' ''کھلتی کلیاں'' اور ''ید بیضا'' کے شاعر بے بدل، ادیب کامل، عالم، فاضل اور ماہر تعلیم تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں پچھلے سال وفات پائی۔ فکری وفنی اعتبار سے ان کی غزلوں اور نظموں میں دل گدازی، جاں نوازی، بیباکی و صفائی، طنز وظرافت کی چاشنی، نئی علامتوں اور عصری استعاروں کے ذریعہ وہ اپنے شعر کو درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں۔ انکی شاعری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ''نور وظلمت'' کے تضادات سے فکر وفن کی نئی نئی تہوں کو کھولنے کا ایک البیلا ہنر جانتے ہیں۔ جس پر قدرے تفصیل سے راقم الحروف نے ''رنگ ونور کا شاعر۔ ابوالمجاہد زاہد'' (مطبوعہ مباحثہ، پٹنہ) میں روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کا یہ مشہور زمانہ شعر زاہد کے بھی حسب حال معلوم ہوتا ہے۔

خاکی ونوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

شاعر کے خیال میں آج کا دور فروغ علم وہنر کے باوجود زمین ''روشنی'' کے لیے ترستی رہتی ہے کیونکہ کبھی وہ لوگ جو خورشید زندگی بن کر اٹھے تھے خود ہی تاروں کی روشنی کے لیے ترس رہے ہیں۔ ایسے میں شاعر کا بڑے خود اعتمادی کے ساتھ یہ دعویٰ ہے کہ

؎ رہ حیات کی تاریکیوں میں اے زاہد
چراغ دل ہے مرے پاس روشنی کے لیے

ان کے خیال میں ہمارے بغیر کہیں بھی زندگی حسین نہ تھی کیونکہ ہم ہی تو حامل ''انوار زندگی'' تھے۔ لہٰذا آج جو تاریکی ہے اسے بہر حال دور ہونا ہے۔ شاعر کا یہ بلند آہنگ اور رجائی انداز آج بھی بڑے بڑے شعرا کے یہاں ڈھونڈے نہ ملے گا۔

؎ کہیں پناہ نہ پائے گی ظلمت دوراں زمیں پہ فصل اُگے گی پھر آفتابوں کی

تمام تر مسائل ومصائب کے باوجود امید مرد مومن کا کمال یہ ہے کہ وہ ''ظلمت

شام" کو "پرچم صبح نو" کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔ شاعر کی یہ رجائیت حقائق سے چشم پوشی پر مبنی نہیں اسے عصر حاضر کے گھور اندھیرے میں بعض اوقات "شب تار" کے پاس ایک بھی تارا نظر نہیں آتا۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود سطح آب تک محدود نظر رکھنے والوں کے مقابلے میں زاہد بحر کی تہہ میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس میں وہ اپنی پرکھارت نہیں جتاتے بلکہ "بے طلب دینے والے" نے انہیں یہ ع "عقل بخشی، چشم روشن دی، دل بینا دیا" اور اس رحمت بے پایاں نے حقیقت پسندی بھی سکھائی

؎ زندگی سے "کچھ نہ دینے" کی شکایت کیا کروں
سوچتا ہوں میں نے خود بھی زندگی کو کیا دیا

زاہد کے خیال میں کتاب زندگی کے اصلاً دو ہی باب ہوا کرتے ہیں اولاً سنگیں حقائق اور دوم کچھ حریری خواب۔ مگر ان کا دینی و علمی مزاج اور تحریکی رجحان انہیں جس نتیجے پر پہنچاتا ہے اس کا سلیس مگر پر بصیرت اظہار انہیں کے الفاظ میں دیکھیں

؎ دل بینا بھی کر خدا سے طلب کہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

زاہد کے اسلامی نظریے کی طرح جاں نثار اختر ترقی پسند فکر و نظر پر یقین کامل رکھنے والے بڑے منفرد اور البیلے شاعر تھے۔ دونوں نے تقسیم ملک سے بہت پہلے شعر و سخن کا آغاز کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے نظریات کے لیے قربانیاں دیں اور کئی طرح کے نشیب و فراز سے بھی گزرے لیکن بحیثیت مجموعی زاہد کے حالات نسبتاً مستقیم ہوتے ہوئے بھی نظری و فکری فرق نے دونوں کے کلام کو بالکل دو رنگ دیدیا ہے۔

جاں نثار اختر کے یہاں نرمی اور بانکپن کے ساتھ جا بجا مایوسی و محرومی کا قنوطی انداز دکھائی دیتا ہے

؎ سوائے گرد ملامت ملا بھی کیا ہم کو بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

؎ ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے

لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

اوراس بکھراؤ کی عبرتناک انتہا دیکھیے

؎ روح کی پیاس کے آگے جسم کی پیاس بڑی ہے

؎ ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا

کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

شاید اسی لیے جاں نثار اختر کے دو محترم ناقدین میں ڈاکٹر محمد حسن نے ان کی تمام تر جدت آفرینیوں کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کے یہاں "آتش رفتہ کا سراغ اور آنے والی صبح کے نور" کے فقدان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے بھی ان کی "رومانیت، جنسیاتی تحلیل اور شاعرانہ مصوری" کو تسلیم کرنے کے ساتھ انکے یہاں "کسی یکراں جذبہ، کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس" کی بڑی کمی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ جاں نثار کو "آج ہر آدمی ادھورا دکھائی پڑتا ہے یہ اس لیے بھی کہ اس ادھورے آدمی کے پاس "نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار" ہے۔

اس کے برعکس ابوالمجاہد زاہد کے یہاں تمام تر محرومیوں اور مصائب و آلام کے باوجود اپنے حدود میں "ایک یکراں جذبہ" بھی ہے اور "دیوانہ بنا دینے والا احساس بھی" ان کی مختصر سی نظم "ہم" کے چند اشعار کی بلند آہنگی ملاحظہ فرمائیے۔

؎ ہم خاک کی معراج ہیں تقدیر زمیں ہیں
ہم اک غزل نور ہیں اک نظم حسیں ہیں
کیا ہم کو مٹائیں گے اندھیرے کے پرستار
ہم صبح یقیں، صبح یقیں، صبح یقیں ہیں

اسی کو کہتے ہیں ع نسبت نور تو خود نور بنا دیتی ہے۔

آخر میں زاہد کے مطمح نظر کی اس بلندی و پاکیزگی کی داد دیجئے اور حاضرین کرام خود اپنے فکرو

نظر پر غور فرمائیں:۔

؎ دھوپ کے ماروں کو جس کی چھاؤں میں راحت ملے
ریگ زار زندگی میں وہ شجر ہو جائیے
لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لیے
زندگی کی وہ کتاب معتبر ہو جائیے

اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ [1]

صدر سمینار جناب پروفیسر ظفر حبیب، نیز جھارکھنڈ اور ملک کے طول وعرض سے تشریف لائے ہوئے مہمانان کرام! اور شہر و بیرون شہر سے آئے ہوئے حاضرین محترم!

اس پر وقار قومی اردو سمینار میں ہم ٹرسٹیز اور اسٹاف مرکز ادب وسائنس ٹرسٹ رانچی آپ سب کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور خوش آمدید کہتے ہیں، اور شکر گذار ہیں کہ ایک ایسے عہد میں جب مقامی سے بین الاقوامی سطح تک ہر جگہ اخلاقی قدروں کے بحران نے پوری انسانیت کو بیابان مرگ میں بھٹکنے پر مجبور کردیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے نے ہمارے سامنے کئی جان لیوا چیلنجز کھڑے کردیے ہیں ہم آپ اردو کے حوالے سے اس اہم ترین مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کے لیے آج یہاں اکٹھا ہوئے ہیں۔

ہماری خواہش تو یہ تھی کہ اردو کے نامور ناقدین ومحققین نے اپنی عمر بھر کے فکر و مطالعہ کا نچوڑ اپنے مضامین ومقالات کی شکل میں جس طرح پیش کیا ہے ان سب کو ان کے ان پر بھرپور غور وبحث کی جاتی۔ مگر وقت کی تنگی کے سبب مجبوراً ہم ۵۔۷ منٹ میں مقالات کی تلخیص کی سماعت تک خود کو محدود کررہے ہیں البتہ اس ٹرسٹ کی روایت رہی ہے کہ اس طرح کے قیمتی مقالوں کو کتابی شکل میں افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے سو انشاء اللہ جلد انہیں مجموعہ کی شکل میں ضرور شائع کیا جائے گا۔ لہٰذا دوران سماعت جو سوالات ذہنوں میں پیدا ہوں انہیں آپ تحریری شکل میں نوٹ کرکے اپنے اور مقالہ نگار کے نام کی وضاحت کے ساتھ پیش فرمادیں تاکہ حسب موقع ان کے جواب دیے جاسکیں۔

---

[1] افتتاحی کلمات بموقع قومی سمینار، زیر اہتمام: مرکز ادب وسائنس تعلیمی وفلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ، رانچی، مورخہ ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء بروز اتوار۔

محترم حضرات! فکری انتشار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ زندگی اور ادب میں اخلاقی قدروں کو جو اساسی اہمیت حاصل ہے انہیں نام نہاد نظریاتی کج مج بحثوں کی نذر کر کے حاشیے میں اس طرح ڈال دیا گیا تھا کہ ان موضوعات پر بعض ادبی حلقوں میں گفتگو کو آؤٹ آف فیشن (Out of Fashion) سمجھا جانے لگا تھا۔

لیکن پچھلی صدی میں خانہ ساز ازموں نظریات اور کئی رجحانات نے دو جنگ عظیم، سرد جنگ اور مقامی تضاد و تصادم نے کروڑہا انسانی قتل و غارت گری کی ایسی شرمناک تاریخ رقم کی جس کی پوری انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ نام نہاد جمہوریت، آزادی، مساوات، انسان دوستی، انسانی عظمت اور انسانی حقوق کے شور و غوغا اور سائنس و ٹکنالوجی کی حیرت انگیز و سرعت خیز ایجادات کے نتیجے میں خلا کی لامحدود وسعتوں میں چاند تاروں پر کمند ڈالنے، DNA, RNA اور جینوم کے بعد گوڈ پارٹیکلس کی دریافت اور Knowledge Based Society کے دعوؤں کے باوجود اس رواں صدی میں بھی بے حسی، بیدردی، بہیمیت اور درندگی میں جو دن دونی اور رات چوگنی اضافہ ہو رہا ہے اس نے اچھے اچھوں کے ہوش گم کر دیے ہیں۔ معروف ملحد فلسفی برٹرنڈ رسل بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ

"اگر سائنسی تہذیب کو برتر تہذیب بننا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حکمت میں بھی اضافہ ہو، حکمت سے میری مراد زندگی کی غایات کا صحیح تصور ہے۔ مگر یہ وہ شے ہے جس کو سائنس مہیا نہیں کر سکتی"

؎ تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم ‏ وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں

مشکل یہ ہے کہ "زندگی کی غایات کا صحیح تصور" مشرق کے اقداری نظام ہی میں پایا جاتا ہے، مغرب کے مقداری نظام میں اسکا فقدان ہے اور المیہ یہ ہے کہ پچھلی کئی صدیوں سے مقداری نظام ہی کا ہر چہار سو غلبہ ہے۔ جس کا مختصر ترین تاریخی پس منظر یہ ہے کہ

برہمنیت، پاپائیت اور قیصریت کے گٹھ جوڑ اور ظلم و بربریت کے ردعمل نے بتدریج مغرب کو منحرف، باغی، ملحد اور اخلاق دشمن بنا دیا۔ اور مادیت، افادیت، لذتیت، لبرلزم، لادینی جمہوریت، قوم پرستی، اشتراکیت اور ماڈرنزم کی آندھی چلی تو نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی ادب میں رومانیت کی لہر سے جو فکری و ادبی انتشار پیدا ہوا وہ ایک مغربی ادیب و دانشور، عظیم ناقد اور شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے لفظوں میں:

''ہوشمندی کے انقطاع کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی ہم کبھی بھی اصلاح نہ کر پائے''

''ہوش مندی کے انقطاع کے اسی سلسلے'' نے انسانی ''اشرفیت'' کو پہلے تو مشکوک بنا دیا، پھر میکانکی، نامیاتی بلکہ ایسا کیڑا سے بھی آگے سے غیر نامیاتی مادہ میں تبدیل کر کے جزوی تجربات، فروعی استنباط اور فارمولہ سازی کی وبا پھیلا کے مابعد الطبیعاتی، اخلاقی اور انسانی تصور کو مسخ کرنے کے بعد جملہ علوم و فنون کو بھی مسخ کر دیا۔ یوں کائناتی اور زندگی کی حرکی وحدت پارہ پارہ ہو گئی تو اس کی کوکھ سے ڈارون کی حیوانیت، مارکس کی شکم پرستی، میکڈوگل کی جبلتی، فرائیڈ کی جنسی، ایڈلر کی خود پرستی اور یونگ کی توہماتی تھیوریوں اور جزوی صداقتوں نے جنم لیا۔ تو پوپ نے خدا کے بجائے انسان پرستی پر زور دیا اور نٹشے نے تو خدا کی موت ہی کا اعلان کر دیا، اور مالرو (۱۹۴۵ء) نے خود انسان ہی کے مر جانے کی خوش خبری سنائی۔ نوبت بایں جا رسید کہ ہر سال چھ ماہ کے بعد نئے نئے فارمولے اور نظریے سامنے آنے لگے۔ مثلاً واقعیت پرستی، زوال پرستی، علامت پرستی، سماجیت پرستی، اظہاریت، لاشعوریت، بے معنویت، فیمنزم، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور نت نئی دبستانی شوشہ بازیاں جن کے زیر اثر ایک عرصہ تک ہمارے اچھے خاصے نقاد اور ادبا و شعرا نصف صدی سے آج تک عجیب و غریب احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کو اپنے زمانے میں غالب ایک گھٹیا درجے کے شاعر نظر آئے

تو استاذی کلیم الدین احمد کو اردو غزل نیم وحشی صنف شاعری اور اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر نظر آئی۔ حسن عسکری اپنے دور اول میں اپنے ذہنی توازن کی برقراری کے لیے ہر ہفتہ ازراپاؤنڈ کے دو چار صفحات کی تلاوت کو ضروری قرار دیتے تو بودلیر اور ملارمے کو بلا وضو پڑھنا حرام سمجھنے لگے۔ اس کے بعد تو جدیدیت کے زیر اثر بے سمتی و بے چہرگی نے نہ صرف افسانہ اور کہانی کا گلا گھونٹ دیا بلکہ اینٹی اسٹوری، اینٹی پوئٹری، آزاد غزل، نثری نظم اور الفاظ کی توڑ پھوڑ کی ادبی دہشت گردی شروع ہوگئی۔ ادھر مغربی تہذیب کے استعماری مزاج، یکر خاسائنسی ترقی اور مادی دوڑ دھوپ اور ڈاکٹر کوپی چند نارنگ کے لفظوں میں ''برقیاتی اور تکنیکی تبدیلیوں نے معاشرہ کو دیکھتے ہی دیکھتے میڈیا سوسائٹی یا تماشا سوسائٹی میں بدل کے رکھ دیا ہے''۔ اب مابعد جدیدیت کا رشتہ کثیر قومی سرمایہ داری سے جڑ کے کالونزم کی جدید صورت گری کی جارہی ہے۔ اور بہت سی جانی مانی صداقتوں کو جھٹلانے کی کوشش ہورہی ہے کہ موجودہ عہد کے مزاج کو تفرق آشنا قرار دیا جارہا ہے۔ اسی لیے ان کے نزدیک معنی کا کوئی مرکز نہیں اور کثیر المعنویت پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا۔ انسانی ذہن کو مابعد جدیدیت، بے باک، نڈر اور کشادہ بنانا چاہتی ہے چنانچہ ڈاکٹر شبنم سبحانی کے لفظوں میں ''مصنف کو کنارے لگا کر کسی تخلیق کے متن کو قاری کے مکمل طور پر حوالے کیا جارہا ہے''۔ اس تضاد کا یہ حال ہے کہ ایک طرف تو یہ نظریہ اقدار اور حق و باطل کو جانچنے کے کسی طے شدہ پیمانے کے سخت مخالف ہیں تو دوسری طرف سماج اور زندگی کی اقدار سے اپنا رشتہ بنائے رکھنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ ماضی، روایات، مذہبی اقدار اور نظریاتی اثاثے کو تہہ و بالا کر کے یہ ایک نئی اور خیالی دنیا کی تعمیر چاہتے ہیں۔ مگر آج تک مابعد جدیدیت نے کوئی اعلیٰ درجے کا تخلیقی کارنامہ پیش نہیں کیا ہے۔ البتہ انہدام، تغیر اور نئے تجربات کے زبانی دعوے مسلسل کیے جارہے ہیں۔

شکر ہے کہ بیسویں صدی کے تقریباً تمام ہی ازموں بشمول کمیونزم کا فکری و عملی

جنازہ نکل چکا ہے اس لیے اہل نظر از سر نو غور و فکر کر رہے ہیں۔ وہی ڈی، ایچ لارنس جو انسانی تعلقات کے ادب کی موت کا اعلان کر چکا تھا اب نئے اور جاندار ادب کے لیے مشرقیوں کو اسکا مشورہ ہے کہ مشرق، مغربی ادب کو پہلے اپنے اندر جذب کرے اور پھر اپنا راستہ خود ڈھونڈے۔ مشرق کے لیے یہ زیادہ مشکل اس لیے نہیں کہ مغربی تہذیب کی بنیاد اگر طبیعات یا مادیات پر ہے تو مشرقی تہذیب کی بنیاد مابعد الطبیعات یا روحانیات و اخلاقیات پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی ادبیات کی بنیاد بالعموم مذہبی تعلیمات، اخلاقی اقدار، تہذیب و شائستگی اور اخلاق حسنہ پر مبنی ہے۔

؎ شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

چنانچہ مشرقی ادب و شاعری اور مذہب میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ ایلیٹ جب یہ کہتا ہے کہ "ادب مسرت کے سوا کچھ اور دیتا ہے تو "یہ کچھ اور" حق و صداقت کی آفاقی قدروں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اخلاقی و تعمیری قدریں نیکی و روحانی پاکیزگی کو جلا بخشتی ہیں، ایثار، حریت، (انسانیت پرستی نہیں) انسانیت دوستی، محبت، خدمت اور محنت و مشقت پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ تعمیری اقدار لازماً عقیدہ پر مبنی ہوتی ہیں اور پائیدار عقائد میں کائنات کی مافوق الفطری توجیہہ جز و لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ تعمیری یا اخلاقی ادب دراصل خدا، کائنات اور انسان کے رشتوں کو ایک وحدت میں مدغم ہو کر اخلاقی و روحانی طرز احساس کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ وحدت و ہم آہنگی ہی تشدیدی و تمجیدی عمل کو تمیز کرتا ہے اور احساس جمال کو تخلیق سے ہم آمیز کرتا ہے۔ اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ حسن کے دو بنیادی عوامل یعنی ہم آہنگی (Harmony) اور تناسب (Proportion) جب تک

ایک وحدت میں مدغم نہ ہو جائیں جمالیات کا ظہور ممکن نہیں۔ اسلام زندگی کو ایک حرکی وحدت قرار دیتا ہے اور اسلامی جمالیات دراصل نام ہے وحدت، تناسب، تعدیل، تسویہ اور توازن کا۔ مشہور انگریزی نقاد کلینتھ بروکس بھی فن کے عناصر اربعہ میں تہذیبی سرگرمیوں کے شعور کو لازمی قرار دینے پر مجبور ہوا کیونکہ تہذیب کا تصور مذہب یا خدا پرستی کے تصور کے بغیر ناقص رہے گا۔ ایک انگریزی ناول نگار کا قول ہے کہ

"ادیب کو کسی ولی اللہ کی طرح دیانت دار اور ایمان دار ہونا چاہیے۔
وہ یا تو ایمان دار ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جیسے عورت یا تو باعصمت ہوتی
ہے یا نہیں ہوتی۔"

مغربی فکر و فلسفہ کے خدا پرست ماہرین و مفکرین، آئن اسٹائن، سی، ای، ایم جوڈ اور ولیم جیمز وغیرہ خدا پرستی اور روحانی و اخلاقی اقدار کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ ادب میں حسن، خیر اور صداقت کی دینی بنیادوں کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔

اسلامی ادبی روایات کا امتیاز یہ ہے کہ وہ فنی لوازم کے تمام اور اقداری عناصر خیر کے احترام کی منزلوں سے گزرتی ہوئی ماورائی عظمتوں تک پہنچتی ہیں۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، رومیؔ و جامیؔ، حافظ و سعدیؔ، نیز میرؔ، دردؔ، غالبؔ، اقبالؔ، ماہرالقادریؔ، نعیم صدیقیؔ، حفیظ میرٹھیؔ، سہیل احمد زیدیؔ، عزیز بگھرویؔ وغیرہ اسی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں ہیں۔

تعمیری و اخلاقی اقدار جملہ علوم و فنون کو حیوانی سے انسانی اور انسانی سے روحانی صداقتوں کو ہمکنار کرتی ہیں کیونکہ علما و صوفیا اور اسلامی دانشوروں نے تربیت و تزکیہ کے ذیل میں نفس مطمئنہ، نفس لوامہ اور نفس امارہ اور حقوق النفس کے تحت، معرفت نفس، احتساب نفس، تربیت نفس اور عزت نفس جیسے موضوعات پر اتنا بڑا علمی و عملی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے کہ اس کی کوئی نظیر دنیائے علم و ادب میں پیش کرنی مشکل ہے۔ اخلاقیات کے ذیل میں: اخلاق ناصری، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی اور گلستاں، بوستاں کی کلاسیکی اہمیت سے

ایک دنیا واقف ہے۔ٹی،ایس،ایلیٹ (۱۹۵۶۔۱۸۸۸ء) تسلیم کرتا ہے کہ

''ادب (یہاں صرف تخیلی ادب مراد ہے) ہمیشہ کسی نہ کسی اخلاقی معیار ہی پر پرکھا جاتا ہے اور ہمیشہ پرکھا جاتا رہے گا۔'' (ایلیٹ کے مضامین۔ ترجمہ جمیل جالبی ۴۳)

اردو کے مشہور ناقد آل احمد سرور کا یہ قول بھی یادگار ہے:

''ادب میں جب بھی مذہبی اقدار اور اخلاقی بنیادوں پر استوار تہذیبی ڈھانچہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے تو تاریخ کے صفحات پر لازوال اور عہد ساز بن گیا ہے۔'' (ادبیات محمود۔اول۔۴۳)

ان حقائق کے علاوہ ایک تاریخی صداقت یہ بھی ہے کہ تقریباً تمام ہی مذاہب کی مقدس کتابیں مہابھارت، رامائن، بائبل قرآن یا گرو گرنتھ صاحب سب کی سب آج بھی مذہبی کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کی بیش قیمت ادبی شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں۔

اردو زبان وادب کا آغاز وارتقا ہی صوفی سنتوں، بزرگوں اور ولیوں کی کاوشوں سے ہوا۔اردو

کے جملہ شعری ونثری کارناموں پر خدا پرستی واخلاق مندی اور دعوتی وتبلیغی اثرات کا بہر اعتبار سے غلبہ ظاہر وباہر ہے۔مورخین نے نشان دہی کی ہے کہ مجدد الف ثانی کے اثرات سے اردو شاعری اور تحریک شاہ ولی اللہ سے اردو نثر گہرے طور پر متاثر ہے۔مولوی خرم علی بلہوری، قاضی علاؤالدین بگھروی، حکیم مومن خاں مومنؔ، شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان، مفتی صدرالدین آزردہ (شاگرد شاہ عبدالعزیز)، کرامت علی جونپوری کی دعوت و اصلاح پر ۴۴ کتب، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی عظیم آبادی وغیرہ کے کارنامے تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں۔مزید یہ کہ قرآن وحدیث، تاریخ وسیر وغیرہ کی اہم کتب کے ترجمے اور طبعزاد تفہیم القرآن، سیرت النبی وغیرہ کے علاوہ مختلف مذاہب کی مقدس کتابیں اور ان

پر جو قیمتی لٹریچر کا اردو میں دوسو سالہ ذخیرہ ہے اسکی مثال ملک کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کر سکتی۔

ان کے علاوہ تحریک جدوجہد آزادی پر نظم ونثر صحافت اور خطابت کے جو عدیم النظیر کارنامے اردو میں ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ سرسید، حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی، اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے حالی کی یاسیت سے آگے بڑھ کر خودشناسی وخوداعتمادی اور سرفروشی کی جو نئی تاریخ رقم کی ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اور اکبر واقبال کی نظمیں اور اشعار آج ایک صدی پرانے ہونے کے باوجود اسکا جادو برصغیر کے سر پر چڑھ کے بول رہا ہے۔ بیشک اردو شاعری کی تاریخ میں عمدہ سے عمدہ شاہکار نظموں کی تخلیق ہوئی ہے لیکن اقبال کی مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق وغیرہ جیسی نظموں کا آج بھی کوئی جواب نہیں۔ بجہ ظاہر ہے کہ تعمیر پسند اور اخلاقی اقدار کے حامل تخلیق کار جوش حیات، مثبت انداز فکر اور اعلیٰ انسانی قدروں کو
فروغ دے کر مسرت کے ساتھ بصیرت کا بھی سامان فراہم کرتے ہیں۔ وہ الحادی ادیبوں کی مادہ پرستی، جبریت، اشتہاریت نیز بے چہرگی وبے سمتی اور ابتذال کے بجائے پاکیزگی جذبات وخیالات، پختگی فکر، قوت استدلال، وسعت معلومات، عرفان واخلاص، جمالیاتی انداز، جدت وانبج اور موثر اسلوب سے کام لیتے ہیں کیونکہ تعمیری تخلیق کار توحید اور وحدت آدم کی بنیاد کے ساتھ مادرائیت، اخلاق کے ساتھ روحانیت، رجائیت، عظمت آدم، مستضعفین کی خیر خواہی اور مساوات انسانی کے مخلص ترین علم بردار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اردو ادب کا بیشتر حصہ اخلاقی اقدار سے مالا مال تاریخ میں ظاہری وباطنی، ذہنی وروحانی،

جذباتی و جمالیاتی، مادی و ماورائی عوامل کے متوازن اور حسین امتزاج کی روایت سے ہمیشہ درخشاں رہی ہے۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

(اقبال)

اردو زبان و ادب کا منظر نامہ [1]

خواتین و حضرات! کسی ادبی تحریک کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس دور میں کام کر رہی ہے، اس کی روحِ عصر اور زبان و ادب کے منظر نامے سے کماحقہٗ باخبر رہے۔ فاضل مقالہ نگاروں نے اردو نظم و نثر، فکرِ مغرب کے اثرات، تحقیق و تنقید کی صورت حال اور اہم مسائل پر نہایت فکر انگیز مقالات پیش فرمائے۔ اس لئے خاکسار کا کام خاصا آسان ہو گیا ہے۔ البتہ موجودہ ملکی و عالمی صورت حال کا مجموعی منظر نامہ اختصار سے پیش کرنا قدرے مشکل مسئلہ ہے کیونکہ سائنسی و علمی دھماکے، گلوبلائزیشن اور نیو کیپٹلزم کی سودی قہرمانی یا نیو ورلڈ آرڈر نے اس منظر نامے کو بے حد پیچیدہ اور گنجلک بنا دیا ہے۔ مقامی سے عالمی پیمانے پر بظاہر اسلام، مسلم، اردو دشمنی اور اخلاق باختگی نے اس صورت حال کو نہایت تشویشناک بھی بنا دیا ہے۔

مائیکرو، بایو اور نکلیر ٹکنالوجیز نے نالج پاور (Knowledge Power) کا بول بالا کر دیا ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کا زور ہم اور آپ باورچی خانے سے لیکر عالمی تجارتی مراکز تک دیکھ رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ہی کئی مسلم ملکوں کو تاراج، کئی حکمرانوں کو اعلانیہ اور خفیہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ دنیا بھر میں مظلوم و مقہور مہاجرین کی سب سے بڑی کروڑوں کی تعداد میں ہر جگہ مسلمان ہی پائے جاتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ ۵۶ر مسلم ممالک کے حکمراں اور عوام کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بے حسی و بے عملی ایسی کہ حساس افراد اگر اپنا سر پیٹ لیں تو غلط نہ ہو۔ ایک ایسے ہی مظلوم شاعر کا درد آپ بھی محسوس کیجئے:

---

[1] خطبۂ صدارت، کل ہند ادبی کانفرنس ادارۂ ادب اسلامی ہند، مورخہ: ۲۹/ مارچ ۲۰۰۸ء، انالطیفی ہال، صابو صدیق پالی ٹکنک، ناگپاڑہ، ممبئی۔ بوقت ساڑھے آٹھ بجے شب۔

؎ عذاب ایسا کسی اور پر نہیں آیا کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش

صاحبو اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے (افتخار عارف)

ایک طویل اور گہری منصوبہ سازی کے ذریعہ مغربیوں کے درمیان کی سرد جنگ ختم ہو چکی ہے مگر عالم اسلام پر یکطرفہ قہرمانہ جنگ تھوپ کر نیا بین الاقوامی بندوبست تشکیل دیا جا رہا ہے۔ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ پوری دنیا کو جہاں تک ممکن ہو چھوٹی چھوٹی آسانی سے قابو میں آنے والی ریاستوں ہی میں نہیں بلکہ ان کی نسلی بقائیلی علاقائی اور مسلکی عصبیتوں کو ہوا دیکر ان کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا جائے۔کیونکہ یورپ اور امریکہ نے نام نہاد ہی سہی مگر خلافت عثمانیہ کی وسعت وصلابت کا صدیوں تک مزہ چکھا تھا۔وہ خوب جانتے ہیں کہ بڑا جغرافیہ قوموں میں بڑی قومی انا پیدا کرتا ہے اور اس سے مزاحمت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔امریکہ،چین اور خود ہمارا ملک ہندوستان خود کو منظم ومتحد رکھنے کے جتن کے ساتھ مسلم دنیا میں ایک جگہ مسلم دوست نظر آتے ہیں تو دوسرے کئی مقامات پر خود اپنے ہی سیکولر،جمہوری اور انسانی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلم دشمنی پر آمادہ رہتے ہیں۔

فلسطین کے حماس کی دوتہائی اکثریت سے حاصل کردہ حکومت کو امریکہ اور اسرائیل نے یورپی یونین کی مکمل حمایت سے پہلے تو ان کے درمیان ایک سیاسی منافق کو پیدا کیا۔انہیں دولخت کر کے اور ان کی جائز حکومت کو برطرف کر کے تقریباً ۱۵/لاکھ کی مسلم فلسطینی آبادی کو حبس دوام میں مبتلا کر کے ہٹلر کے نام نہاد ہولوکاسٹ کو بھی مات کر دیا ہے۔مصری ڈکٹیٹر شپ کے فرعونی تسلط کی تین دہائیوں کے باوجود امریکہ اور مغربی اتحادیوں کا رومانس برقرار ہے۔الجزائر میں دو دہائی قبل انتخابات میں ۸۰/فیصد نشستیں حاصل کرنے والی عوامی قیادت سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہیں خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا گیا۔اسی طرح ۵۵/سال پہلے ایران میں ایک جمہوری حکومت کا تختہ پلٹ

کے بادشاہت بحال کی گئی اور موجودہ ایران کی اسلامی جمہوریہ کو جس طرح گھیرا جا رہا ہے اس ننگی جارحیت کو پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔

مغرب اور دشمنان اسلام کی لوٹ کھسوٹ یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ کائناتی لوٹ تک دراز ہو چکی ہے اور نوبت بایں جارسید کہ ماحولیاتی آلودگی، گرین ہاؤس گیسز گلوبل وارمنگ، میٹھے پانی کی قلت اور جہنمی زندگی کی ارزانی نے خارج کے ساتھ داخلی زندگی کو بھی درہم برہم کر دیا ہے۔

اس تہذیب مغرب نے خاندان کے تصور ہی کو مٹا ڈالا ہے۔ ان کے بیشتر مرد و زن نئی نسل کی پرورش کے بجائے محض وقت گذاری اور عیش کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں۔ جہاں کسی کی ولدیت پوچھنا معیوب ہے، جہاں جنس زدگی اس قدر غالب آچکی ہے کہ امرد پرستی اور لواطت سے آگے بڑھ کر مرد مرد سے اور عورت عورت سے شادیاں کر رہی ہیں۔ چنانچہ ان کی آبادی میں بوڑھوں کا تناسب دن دونی رات چوگنی بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کی زندگی سے بھرپور نظریہ اور نظام کے مقابلے میں کیسے ٹھہر سکتی ہے جس نے محض عقیدے اور عظمت کردار کی طاقت سے روم و ایران کی سپر پاورز کو شکست فاش دیدی تھی جس کے پریشان حال دیوانے آج بھی خالد و حیدر کے افسانے سنا رہے ہیں۔

افغانستان اور عراق میں محض اپنے عقیدے کی طاقت سے دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ افواج کے دانت بقول شخصے کھٹے ہی نہیں توڑ کر رکھ دیئے ہیں۔ جس کے جذبۂ شہادت نے مسلمانوں کو نا قابل تسخیر بنا دیا ہے جو تن تنہا دشمن کے لشکروں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ بقول اقبال

ع مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جمہوری انداز سے منتخب قیادت چونکہ عوامی اسلامی ایجنڈے کی حامل ہوتی ہے

اس لئے مسلم ڈکٹیٹر مغربی اتحادیوں کے لئے ہمیشہ پیارے ہوتے ہیں تا کہ ان کے کندھے پر بندوق رکھ کر وہ اپنی گولیاں داغنے کی پوزیشن میں رہیں۔ اس وقت ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔

ان تمام تلخ تر حقائق کے باوجود مشیت ایزدی اپنا کام کر رہی ہے۔ اسلامی نظریہ توحید و رسالت انسانی اخوت، عزت نفس کی پاسداری، عورتوں کے حقوق، ماؤں کی برتری اور علم نافع، نیز تصور تسخیر کائنات کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ملک اسلام دشمنی میں سب سے آگے ہے وہیں قبول اسلام اور فروغ اسلام کی لہر اتنی ہی تیز ہے۔ اس سے بھی آگے ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ مغربی دانشوروں کا ایک طبقہ ۱۹ رویں اور ۲۰ رویں صدی کے خانہ ساز نظریہ بازوں کی قلعی کھول رہا ہے۔ آئین اسٹائن کے (Theory of Relativity) یا نظریہ اضافی، ہیومن جینوم کی عظیم الشان تحقیق اور نظریہ تخلیقیت (creation) نیز علم طبعیات کی انتہا خالق اعلیٰ اور ایک مالک کُل کے سامنے تسلیم و رضا جیسے حقائق نے ۲۰ رویں صدی کے اواخر میں ڈارون کی حیوانیت، مارکس کی شکم پرستی، میگڈوگل کی جبلت پرستی فرائیڈ کی شہوانیت، ایڈلر کی خود پرستی اور یونگ کی توہم زدگی کو رد کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی طرح مختلف سیاسی ازموں، سوشلزم، کمیونزم، نازی ازم، مارکسزم اور ڈیمو کریسزم کے بعد نیو کیپٹلزم کو بھی دنیا رد کر چکی ہے۔ چنانچہ ورلڈ سوشل فورم (W.S.F.) کی شکل میں ایک نئی آواز ابھر رہی ہے جو برازیل سے بمبئی کے آگے بھی گامزن ہے۔ ۱۶ تا ۲۱ رجنوری ۲۰۰۴ء کو آپ کے اسی شہر میں ۱۵۰ رملکوں کے ایک لاکھ سے زائد نمائندوں نے ۱۶۰۰ موضوعات پر ۱۲۰۰ سیشن کئے۔ دو عظیم الشان عالمی نوعیت کے جلسے منعقد ہوئے۔ ۵ رپینل ڈسکشن۔ ۴ گول میز کانفرنسیں، ۴ رجلسۂ عام جن میں ۱۵ تا ۲۰ ر ہزار نفوس نے شرکت کی۔ اس تمام بھیڑ بھاڑ اور ذہنی ورزش کا ماحصل یہ سامنے آیا کہ موجودہ سیاسی نظریاتی اور معاشی خوشحالی کے کھوکھلے نعروں میں فریب مسلسل

کے سوا کچھ نہیں ہے۔

؎ ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

ضرورت ایک نئی دنیا کی تعمیر وتشکیل کی ہے جو ممکن ہے۔یعنی Another world is possible مگر اس خاکسار کا کہنا یہ ہے کہ It is impossible without Islam کیونکہ خدا، کائنات اور انسان کے تین حقائق کے درمیان حقیقی رشتوں کا توازن کسی کے پاس نہیں۔اس سے بھی آگے انسانوں کے درمیان مزید تین رشتوں کے متوازن ربط کا نسخہ کس کے پاس ہے۔؟ میری مراد (۱) انسان کا انسان سے رشتہ (۲) مرد کا عورت سے رشتہ اور (۳) فرد کا اپنے نفس سے رشتہ۔ان چھ رشتوں کی حقیقت وماہیت وہی بتا سکتا ہے جس نے اس کائنات اور انسان کو خلق کیا ہے۔ان حقائق تک مغرب اپنے خانہ ساز نظریات کے ذریعہ قیامت تک نہیں پہنچ سکتا۔اسی لئے مفکر اسلام اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں واشگاف کیا ہے کہ

"یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں"،ص:(۲۷۶)

ان کے خیال میں موجودہ استحصالی طرز سیاست ومعیشت کے بجائے جن تین چیزوں کی عالم انسانیت کو ضرورت ہے وہ صرف اسلام کے پاس ہے یعنی:۔

"(۱) کائنات کی روحانی تعبیر (۲) فرد کا روحانی استخلاص اور (۳) وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہے اور جن سے انسانی معاشرہ کا ارتقاء روحانی اساس پر ہی ممکن ہے۔"

جس نظام تعلیم اور علمی وسائنسی دھماکے کا اس قدر شہرہ ہے اس کا اصل فساد یہ

ہے کہ اس نے معلم حقیقی اور رحمت عالم کے خلاف اپنی مادہ پرستی وعیش کوشی کے سبب ایک محاذ کھڑا کرلیا ہے۔اور اندھی دشمنی میں مبتلا ہو کر حقیقی اسلام کے بجائے عالم اسلام پر جو مغرب خانہ زاد اسلام یعنی ''موڈریٹ اسلام'' اور اپنے وطن کے ہندوتوادی ''محمدی ہندو'' کا نسخہ پیش کررہے ہیں۔معروف دانشور ڈاکٹر سندیپ پانڈے (۲۰۰۲ء کا میگا سامی انعام یافتہ) کے لفظوں میں:

''موجودہ نظام تعلیم ہمیں مکمل طور پر بے حس یا Desensitize کر دیتا ہے۔اعلیٰ تعلیم یافتہ سب سے زیادہ بے حس، فرقہ پرست، مغرور، متعصب، جھگڑالو، اور بداخلاق ہوتا ہے۔کیونکہ موجودہ روایتی تعلیم محض روزگار رخی ہے جس کی بنیاد مسابقت، غرور، تعصب، ٹکراؤ اور بداخلاقی پر قائم ہے۔تکنیکی تعلیم اکثر جنگی ہتھیار اور انسانی تباہی کی طرف رخ کرتا ہے۔'' (ہندوستان ٹائمز مورخہ 7.9.03)

چنانچہ اب بہت سے جدید مغربی ومشرقی دانشوروں نے حقیقت پسندی سے کام لینا شروع کردیا ہے۔جدید تر سائنسی وسیاسی وسماجی حقائق نے اب انہیں اخلاق مندی و خداپرستی کی طرف مائل کرنا شروع کردیا ہے۔اوائل بیسویں صدی تک جملہ علوم وفنون تو کجا ادب کو بھی خداپرستی اور اخلاق سے جوڑنا آؤٹ آف فیشن اور ہتک سمجھا جاتا تھا۔مگر بیسویں صدی کے اواخر تک آتے آتے عام علوم ہی نہیں خالص سائنسی وٹکنیکل علوم مثلاً جملہ شعبہ جات انجینئرنگ، مینجمنٹ، مالیات اور سیاست ومعیشت کو بھی اخلاقی وروحانی قدروں سے (Ethical and moral Values) سے جوڑنے کی روچل پڑی ہے۔

اس ملکی اور عالمی تناظر میں اردو زبان وادب کا منظرنامہ بعض دشواریوں کے باوجود نہایت امید افزا اور حوصلہ مندانہ ہے بشرطیکہ خوداردو والے اردو کے ساتھ خلوص

اور محبت کے ساتھ پیش آئیں۔ کیونکہ اردو محض ایک زبان نہیں، لسانی عمل کے ساتھ ایک عظیم کلچر کی ترجمان ہے۔ روز اول سے اس کی سرشت میں توحید و رسالت اور آخرت کے تصورات کا غلبہ رہا ہے چنانچہ وہ پڑوسی اور علاقائی زبانوں کے آغاز ہی سے معاون و رفیق رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال، فیض، سعادت حسن منٹو، علانیہ پنجابی رہے اور اپنے گھروں میں اپنی مادری زبان میں گفتگو کے باوجود اردو کے بہترین شاعر اور فنکار بھی رہے۔ اگر جائزہ لیں تو اردو میں آج بھی دولسانی اور سہ لسانی فن کاروں کی خاصی تعداد موجود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ملک کی جمہوریت (Democracy) جس پر بعض اوقات بجومیت (Mobcracy) کا گمان ہوتا ہے۔ اپنے فکر و عمل کے تضاد کے سبب اردو کے جائز دستوری و لسانی حقوق کو نصف صدی سے مسلسل غصب کر رہی ہے۔ ایک ہندی ناول نگار نے بڑے متکبرانہ انداز میں شاید اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لئے اردو کو "مردہ" (Dead) قرار دیدیا ہے۔ مگر پچھلی کئی صدیوں سے منافقانہ اور پیچیدہ ملکی صورت حال کے پیش نظر ایک صدی قبل نواب محسن الملک جیسے مخلص اردو نے بھی اس طرح کی مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ بعض ریاستوں میں فی الواقع اردو کو نہایت کڑے مسائل کا سامنا ہے بھی مگر دارالترجمہ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے خون ناحق کا معجزہ یہ ہوا کہ اسی شہر میں اردو کی جدید ترین یونیورسٹی، روائتی، فاصلاتی اور آن لائن طریقہ تعلیم کے ذریعہ ادبی، سائنسی، تکنیکی اور پیشہ وارانہ علوم و فنون کو اردو ذریعہ تعلیم سے ملک گیر ہی نہیں، عالمگیر بنا رہی ہے۔ ملک کی چھ ریاستوں میں دستوری اعتبار سے اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ آٹھ ریاستوں میں اردو اکادمیاں بعض خامیوں اور کمیوں کے باوجود فروغ اردو کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مختلف علوم و فنون پر سینکڑوں کتابیں شائع کر رہی ہے۔ کمپیوٹر جیسی تکنیکی آئی۔ ٹی

،مشین کی بنیاد پر اردو میں ۳۰ر ہزار سالانہ ڈپلوما حاصل کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان میدان عمل میں آرہے ہیں۔ ۵۰ر سے زائد یونیورسٹیوں، ہزاروں اسکولوں اور مدارس میں کروڑوں بچے اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھ رہے ہیں۔ بعض غیر ہندی علاقے مثلاً کیرالہ، تری پورہ اور تامل ناڈو غیرہ میں اردو کے خلاف نفرت نہیں پائی جاتی بلکہ ان علاقوں میں بھی اردو تعلیم وتدریس کے جابجا مراکز پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعداد میں کمی کے باوجود رقبہ میں اردو کا علاقہ ہندی سے وسیع تر ہے۔ عوام، پرنٹ اور الکٹرونک میڈیا کی زبان جس تیزی سے اردو الفاظ کو اختیار کر رہی ہے، اس نے ملک بھر کی لنگوافرانکا ہندی نہیں اردو ہی کو برقرار رکھا ہے اور یونانی علم طب کا مکمل وجود اردو ہی سے وابستہ ہے۔

اردو کے سلسلے میں علمی، ادبی اور لسانی حقائق بھی ملک کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں زیادہ امید افزا اور قبول عام کی خصوصیات سے متصف ہیں۔ مثلاً اس کا رسم الخط سائنٹفک اور شارٹ ہینڈ جیسا ہے۔ اردو حروف تہجی کی آوازیں مثلاش، خ، غ، ق وغیرہ ہندی کی بندی سے بے نیاز ہیں۔

غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ جیسی صنفیں بہت سی زبانوں میں ناپید ہیں، اس کی تلمیحات (مثلا، سہراب رستم، شیریں فرہاد وغیرہ) علامتیں، شعری اور ادبی روایات، عروض اور قوافی وغیرہ ایسے محاسن ادب ہیں جو دوسری ادبیات میں ناپید ہیں۔ اس لئے ہمیں کسی احساس کمتری یا کم ہمتی میں مبتلا ہونے کی مطلق ضرورت نہیں۔ مزید یہ کہ جدید تر رجحانات میں اپنی جڑوں سے دوبارہ جڑنے کا احساس، مذہب اور خدا پرستی سے والہانہ لگاؤ، اخلاقی وروحانی قدروں سے وابستگی کی تڑپ اور پختگی فکر کے ساتھ عام فہم زبان اختیار کرنے کے انداز نے اردو زبان وادب کے روشن مستقبل کو اور نکھار دیا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم آئینی ودستوری حقوق کی بازیافت کی جمہوری انداز میں تگ و

دو کرنے کے ساتھ اپنے اپنے گھروں اور نئی نسلوں کو اردو سے آشنا کرتے رہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کی نباضی کرتے رہیں اور اپنی ادبی تنظیم کو اس کے مطابق ڈھال کے آگے بڑھاتے رہیں۔ ماتم اور خود رحمی کے ماحول سے نکلیں اردو کے ایک جیالے حکیم عبدالحمید صاحب کی تنہا ذات کے کارناموں پر نظر رکھیں کہ نہایت سخت حالات میں ایک فرد واحد نے ایک یونیورسٹی ہی نہیں قائم کر دی بلکہ اپنی مخلصانہ سعی و جہد سے فن طب میں نئی جان ڈال دی۔ استاذی علامہ جمیل مظہری کے لفظوں میں:

؎ یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر

تحریک اور جمود
(تعمیری ادب کے تناظر میں)

تعریف: لفظ تحریک حرکت سے مشتق ہے۔ جمود اس کا متضاد ہے۔ ''ایک خاص مدت یا خاص مسافت میں کسی قوت یا کسی مادہ یا فکر پر اثر کرنا حرکت ہے۔ اس کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ حسی اور غیر حسی۔

مثالیں: ۔پتھر پھینکنا۔ کولہ داغنا، ہنسنا، بولنا، غور و فکر۔ پانی کا بہنا بوجہ رقیق اور جاذبیت ارض، عضلات کی قوت سے چلنا، پھرنا۔ ٹرام، برقی قوت، برقی تار کے ذریعہ پہیوں تک پہنچتی ہے اور، یہ برقی قوت ڈائمو (Dynomo) کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے ڈائنازم، بخار، حرارت، ایندھن کے اشتعال یا کسی قوت کے دباؤ، قوت اشتعال ایتھر کے تموجات اور ابلتا ہوا پانی متحرک ہیں مگر فرج کا وہی پانی منجمد برف ہے۔ جو ہلکا ہے۔

حرکات قلب، تنفس، عصبی، جمادات، نباتات، زمین و آسمان بلکہ پوری کائنات حرکت کی برکت سے رواں دواں ہے۔ ہم جس چیز کو قوت سے تعبیر کرتے ہیں وہ حقیقت میں ایک حرکت ہے۔ وہ حرکت بھی مختلف حرکی تسلسل کا نتیجہ ہے۔ مگر حرکات سببی کے سلسلے کو چاہے جتنا پیچھے ہٹا دیا جائے اسکا سلسلہ ہرگز ختم نہ ہوگا بلکہ پیچھے ہٹتے ہٹتے ہم ایک مسبب الاسباب۔ تمام قوتوں کی قوت محرکہ تک پہنچتے ہیں۔ سبب بغیر مسبب ناممکن ہے۔ لہٰذا خدا، بھگوان یا God کو حقیقت، شعور یا روح قرار دینے کی منطقی مجبوری بھی ہے۔ صدائے کن فیکون اسی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

اقبال نے تمام حرکات کا منبع ذات واحد خدا کو تسلیم کیا ہے۔

؎ چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے

یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول

اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول۔

اس کا انگریزی متبادل Movement (آکسفورڈ ڈکشنری)۔

"A series of action and endevours of a body of person for a special object."

عناصر اربعہ:۔ اس تعریف کی رو سے (۱) واضح نصب العین (۲) اجتماعیت (۳) سعی وجہد (۴) حرکات کا تسلسل یا طریق کار ہی کسی تحریک کے اجزائے ترکیبی بنتے ہیں۔

اسی وجہ سے رو، لہر، رویہ، رحجان Union,Mass,Mob، گروپ ایسوسی ایشن وغیرہ اجزا ہیں کل نہیں۔

تحریکیں چھوٹی، بڑی، مقامی، قومی، بین الاقوامی یا بعض جزوی مقاصد کے لیے برپا کی جاتی رہی ہیں۔ جیسے تحریک آزادی، کسان تحریک، تحریک نسواں، خالصتان تحریک، ترقی پسند، تعمیر پسند نیز مذہبی، سیاسی اور سماجی تحریکات۔

اقبال کے نزدیک حقیقت اولیٰ حرکی اور تخلیقی ہے۔ خدا، حسن اور قوت وتوانائی کا مرکز اعلیٰ ہے۔ انسان بھی ایک ایغو اور مرکز حیات کا حامل ہے۔ اسکی منزل مقصود تسخیر کائنات کے ذریعہ رضائے الٰہی اور حیات ابدی کا حصول ہے۔

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی   یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

عظیم اور تاریخ ساز شخصیتیں اسی حرکی قوت سے امر اور انمٹ ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے استعاراتی انداز میں بتایا ہے۔

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے   انساں میں وہ سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی   یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن آغاز ہے عشق، انتہا حسن

تحریکی نوعیت:۔انقلابی: جیسے انقلاب فرانس کے بانیوں (روسو اور گروہ انسائکلوپیڈسٹ) نے شہنشاہیت کو آزادی (Liberty) مساوات (Equality) اور بھائی چارہ (Fraternity) کے آفاق گیر نعرہ سے اکھاڑ پھینکا اور جمہوریت کا علم بلند کیا۔ لادینیت (Seculerism) کا جوڑا سکا ایک الگ حصہ ہے۔

روس، چین، ہندوستان، ایران وغیرہ کی تحریکات آزادی اسی کا شاخسانہ ہیں۔

اصلاحی: انتشار و بحران سے بے چین ہو کر مجددین و مصلحین، لین دین، ترجیح و تنسیخ اور رد و قبول کا عمل شروع کرتے ہیں مثلاً سر سید، حالی، شبلی وغیرہ کی مساعی۔

تحریکات کے لیے احساس بیچارگی، مایوسی و دل شکستگی، رومانیت و تخلیت، دونوں تباہ کن ہیں۔

قوت محرکہ:۔ ایثار، نصب العین کا استحضار، ایمان و عشق اور عصری تناظر میں چیلنجوں کا جواب، احتساب، صبر، اطاعت، رد و قبول، نئے نئے میدان کار کی تلاش اس کی قوت محرکہ مخفی ہیں۔

واضح ہو کہ حرکت عمل ہے۔ اسی میں برکی آزمائش ہے۔ چنانچہ ہر عہد میں فکری و اخلاقی سطح پر جمود کے بعد انبیائی بعثت کا سلسلہ رہا۔ آدمؑ تا محمدؐ پھر حضورؐ کے بعد مجددین و صلحائے امت کا اجتہاد اور تحریکی کاوشیں اس کی بین مثالیں ہیں۔

اسلامی قوت محرکہ:۔ توحید، رسالت و آخرت کی بنیاد پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت، ہجرت اور جہاد مثبت طور پر اور منفی یا سلبی طور پر گمراہی کے تین راستوں پر پابندی (۱) نفس

کی بندگی (۲) باپ دادا کی اندھی پیروی اور (۳) غیر اللہ کی اطاعت، اسلامی قوت محرکہ کی اصل ہیں۔

تاریخی شواہد :۔ان بنیادوں پر اسلام نے ہر قسم کے جمودی طرز فکر سے جنگ کی، ظلم کے خلاف اپنی حرکی قوت سے مورچہ بندی کی، اقتدار وقت سے غلط بنیادوں پر کبھی مصالحت نہیں کی، اسی کی وجہ سے کہا گیا کہ اسلام کی حرکی سرشت ہے۔ "قرآن نے مدینہ کو فتح کیا کیونکہ قرآن سب سے عظیم حرکی کتاب بھی ہے۔

؎ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

بدر و حنین اور یزید و حسین وغیرہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں۔

؎ قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جمود کی ایک اہم ترین دیوار استعماری قوت، جسے اسلام نے ہمیشہ چیلنج کیا داخلی طور پر بھی اور خارجی طور پر بھی۔

عباسیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ۱۳۵ھ میں محمد نفیس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کیا تو امام مالکؒ نے حمایت کی اور منصور کی بیعت کا حوالہ دیا کہ اس نے جبراً بیعت لی جبکہ جبر کا شریعت میں اعتبار نہیں اسی لیے جبری طلاق حرام ہے اس پر گورنر جعفر نے کوڑے لگوا کر لہولہان کر دیا۔ مگر کوڑے کی ہر ضرب پر بآواز بلند کہتے کہ "جبری طلاق حرام ہے"۔ زخمی حالت میں ذلیل کرنے کے لیے انہیں گھمایا۔ تو امام مالکؒ کہتے رہے کہ جو مجھکو جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ "طلاق جبری درست نہیں"۔ امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ بھی ایسے ہی حادثات تاریخ نے رقم کی ہے۔

صدیوں قبل لادینی، یونانی ہیومانزم کی مقبولیت بڑھی تو الکندی، ابن سینا،

الفارابی، اور ابن رشد جیسے تجدد پسند معتزلہ فلسفیوں کے غبارے سے امام غزالیؒ نے ''تہافت الفلاسفہ'' وغیرہ لکھکر ساری ہوا نکال دی۔ اسی طرح امام ابن تیمیہؒ نے عقلیت پسندوں پر آخری مہلک ضرب لگائی اور یہ تسلسل ہنوز جاری ہے۔ سید احمد بریلویؒ (ھندوستان)، امیر عبدالقادر (الجزائر)، جمال الدین افغانی، عبدالرحمن کواکبی، مفتی محمد عبدہ (مصر)، علامہ رشید رضا، حسن البناؒ، قطب شہیدؒ (مصر) شکیب ارسلان (شام، لبنان)، مولانا محمود الحسن، اقبال، ابوالاعلیٰ مودودیؒ (ہندوستان) اور علامہ یوسف القرضاوی (عرب) وغیرہم اس کی واضح مثالیں ہیں۔

مصر میں اخوان کی پانچویں کانفرنس میں (۱۳۵۷ھ) حضرت حسن البناؒ کی آواز کونجی، ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آواز لگائی، محمد علی جوہر اور آزاد نے تحریک جنگ آزادی میں اسی اسلامی حرکی قوت کے بل پر پکارا، اسلام کی حرکی قوت نے افغانستان میں روسیوں اور ایران میں امریکیوں کے پرخچے اڑا دیے۔ کل سارے عالم میں دریدہ دہن رشدی کے Satanic verses کے خلاف، حجاب کے لیے ترکی، فرانس اور انگلینڈ کی نوجوان لڑکیوں کی مورچہ بندی سے واضح ہے کہ ایمانی قوت اہل اسلام کو جمود سے الگ، حرکت بداماں رکھتی ہے۔ کیونکہ ایمان ایک مسلسل جد وجہد کا محرک ہے جو ایک طرف اپنے نفس کے خلاف تو دوسری طرف ناسازگار ماحول اور تیسری طرف باطل نظریات وافکار کے خلاف عمر بھر جاری رہتا ہے۔

یہاں جوش، ہوش کا پابند ہوتا ہے۔ اس لیے کسی ریڈیکلزم یا تشدد کی گنجائش نہیں۔ بلکہ اسلامی تحریکی راہوں میں ایک بڑی قوت اس کی ''مظلومیت'' بن جاتی ہے۔ اور یہی مظلومیت چاروں طرف دل ودماغ کو فتح کرتی چلی جاتی ہے۔

دعوت اسلامی اس معنی میں جہاد ہے کہ یہ غلط بنیاد پر قائم معاشرے اور نظام کو چیلنج کرتی ہے۔ نیز استبداد کا مقابلہ صبر سے کرنے کی تربیت دے کر اپنے علمبرداروں کو

خوف اور مرعوبیت کی حالت سے باہر نکال لیتی ہے۔ یہ جہادی روح ماحول کے ساکت سمندر میں تموج پیدا کر دیتی ہے اور کام اگر اسی طرح آگے بڑھتا جائے تو یہی تموج طوفان بن کر ساحل سے ٹکرانے لگتا ہے۔

ہاں جہاد بمعنی قتال تحریک اسلامی کے کل کا ایک جزو ہے۔ مگر اس کی کئی واضح شرطیں ہیں ان کے بغیر ہر نوجوان جوش میں نعرۂ جہاد بلند کر دینے کا حق ہرگز نہیں رکھتا۔ مثلاً قتال ایک ایسی جماعت کر سکتی ہے جسکی قیادت اغیار کی مداخلت سے آزاد ہو اور دوسری شرط لازم یہ ہے کہ کار دعوت کو اتمام حجت کی حد تک پہنچا دیا گیا ہو۔ مزید یہ کہ قتال محدود ہوتا ہے میدان جنگ تک۔ نہ یہ کہ تحریکی جوش میں آکر دہشت گردی اور تشدد کی راہ اختیار کی جائے۔

لہذا جہاد اکبر، جہاد بالنفس ہے۔ اس لیے گھر اور پڑوس کے درمیان سعی و جہد کی جائے۔

اس وقت دنیا فکر صحیح، اخلاق فاضلہ اور تعمیر خودی سے تقریباً خالی ہوتی جارہی ہے۔ ہٹلر و مسولینی کے بعد روس و امریکی معاشرہ کا حشر ڈارسی (Dorsey) کے لفظوں میں "ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور دینی نظام کے ہر شعبہ میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مظاہرہ ہے"۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس کے برعکس اسلامی تحریکات کے پاس اسلامی نشاۃ ثانیہ کے روشن امکانات کی مستحکم بنیادیں ہیں مثلاً:۔

(۱) اسلام کے بنیادی مآخذ (قرآن و سنت) مفاسد اور بگاڑ سے بالکل پاک جوں کے توں ہیں۔

(۲)اسلامی تعلیمات جامع اور ہمہ گیر ہیں اور کسی دوسرے نظریے کی دست نگر نہیں۔

(۳)اسلامی تحریک وتجدید کا کام تسلسل کے ساتھ دور اول سے جاری ہے۔

(۴)مراکش سے انڈونیشیا تک مسلمانوں کی بھاری اکثریت اسلام چاہتی ہے۔"بہار عرب جس کی زندہ مثال ہے۔

سچ پوچھیے تو ہندوستان کے کفر وشرک اور لادینی نظام سیاست کی چولیں ہل چکی ہیں۔ آستک ناستک، برہمزم، ورن آشرم، مندر مسجد کے بیلون سے اسلامی عدل اجتماعی (Social justice) کا محض ایک عنصر ہوا نکالنے کے لیے کافی ہے۔اسی لیے وہ بدحواس ہیں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا لاوا آج پھر ابل پڑا ہے کیونکہ ان کے پاس مقابلہ کے لیے کوئی نظریہ، نظام یا عقیدہ نہیں۔دلت طبقہ نئے عقائد کی تلاش میں ہمیں پکار رہا ہے لہذا آستک، ناستک، یہ فتنہ وفساد اور فرقہ وارانہ ماحول ایک وقتی عمل ہے جسے جلد ختم ہونا ہے پھر تو سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

؎ یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لاالٰہ الااللہ

یہ جو ہر سطح پر نام نہاد بعض تحریکیں ارتقا کے نام پر برسر عمل ہیں وہ بس ایک مغالطہ ہیں کیونکہ ان کے یہاں ارتقا میں ہر چیز متغیر ہے یہاں تک کہ خدا، انسان، عقید اور مذہب وشرافت بھی، جبکہ اسلامی نقطہ نظر سے حرکت میں "صورتیں" تو متغیر رہتی ہیں مگر "جوہر" غیر متغیر رہتا ہے۔مگر یہ عجیب بات ہے کہ انسان میں غیر متغیر اور ارتقا پذیر اجزا مل کر ایک ہی وحدت بناتے ہیں، ایسی وحدت جو مربوط، پیوست اور متحد ہے اور جس کے اجزا کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔جیسے روح اور جسم۔

یاایھاالناس اتقو ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیراو نساء(النساء)

("اے لوگوں اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں کے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں")

اس طرح کی آیات سے "ربوبیت، وحدت انسانی، صنفی وحدت اور انسانی معاشرہ" کی غیر متغیر بنیادیں فراہم ہوتی ہیں اسلام انہیں پارہ پارہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

لہذا تحریک اور جمود کے ان حقائق کے پیش نظر ہر شخص اور ادارہ کو اپنے عمل کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیئے۔

ہندوستانی ادبیات کی فکری وفنی بنیادیں

(اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور تامل کے حوالے سے)

ایک تحقیقی خاکہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

مقاصد: ہندوستانی ادب وتہذیب اپنی تخلیقیت، مشترکہ کلچر، دانشوری، رواداری اور تنوع کے لیے کثرت میں وحدت کا منظر پیش کرتی ہے۔ مگر ادھر کچھ عرصہ سے بعض متقی اور متعصبانہ مقاصد کے تحت اس اتحاد واشتراک کو انتشار واختلال میں بدلنے کی بھی کوششیں جاری ہیں۔ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ملک کی اہم زبان وادب بالخصوص اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور تامل کی فکری وفنی قدر مشترک اور ان کے باہمی اخذ و استفادے کا مبسوط تحقیقی مطالعہ پیش کیا جائے تاکہ تخلیقی وتنقیدی سطح پر انتشار وافتراق کے بجائے اتحاد ویکجہتی اور مغرب سے مرعوبانہ ذہنیت کے بجائے غیر تمندانہ اور آزادانہ ذہن کی تعمیر وتشکیل میں مدد ملے۔

مفروضات: (Hypothesis) دنیا کے تمام ادب کا راست تعلق انسانی جمالیات، لفظیات، فکر ونظر اور احساسات وجذبات سے ہے۔ مزید یہ کہ انسان از آدم تا ایندم علم الانسان (Anthropology) کی جدید تحقیق کی رو سے بھی ایک ہی فطرت اور سرشت پر پیدا کیا گیا ہے اس لیے ان کے درمیان بنیادی احساسات وجذبات، خیر وشر کے معیار اور تلخی وشیرینی کے ذائقوں میں بہت حد تک یکسانیت بالکل فطری ہے الا یہ کہ کوئی شخص یا کچھ افراد مسلسل کوشش کر کے اپنی فطرت کو ایک حد تک مسخ کر دیں۔ یہ صحیح ہے کہ

زمانی ومکانی، تمدنی ونسلی اور قومی حالات میں جزوی فرق اور تنوع کے باعث ظاہری طور پر کچھ اختلافات کا پایا جانا بھی ایک حد تک فطری ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے انسان ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ سائنسی طور پر بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی جوہر غیر متغیر رہتا ہے اور سطح پر حرکت وعمل سے صورتیں متغیر رہتی ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ انسان میں غیر متغیر اور ارتقا پذیر اجزا مل کر ایک ہی وحدت بناتے ہیں۔ ایسی وحدت جو مربوط، پیوست اور متحد ہے اور جس کے اجزاء کو علیحدہ کرنا ناممکن ہے جیسے روح اور جسم کا امتزاج واتصال

ع: لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

لہذا کسی ایک ہی ملک کے انسانی اور ادبی طرز اظہار میں بظاہر تنوع اور رنگا رنگی کے باوجود ان کے درمیان یکجہتی وہم آہنگی کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ ملک کی مختلف زبان وادب میں انفرادی طور پر تو اس کثرت میں وحدت کے تحقیقی عناصر کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ضرور ہوتا رہا ہے مگر ملک کی اہم اور بنیادی ادبی تخلیقات کی روشنی میں ان عناصر کا یکجا مطالعہ وتحقیق بنوز کسی زبان میں نہیں ہوا ہے۔ آج اس مطالعہ کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ بعض جدید علوم اور سائنس وٹکنالوجی کے زیر اثر دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور علم ومعلومات کی لین دین عالمگیر پیمانے پر گھر گھر ہونے لگی ہے تو پھر ایک ہی ملک کی اہم ادبیات کی فکری وفنی قدروں کی مماثلت وتنوع اور ان کے باہمی اخذ واستفادے کا ایک مبسوط مطالعہ کیوں جلد مکمل نہ کیا جائے؟

ریسرچ ڈیزائن اور طریقہ کار: سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ملک کی ۲۲ قومی زبانوں میں صرف پانچ کا انتخاب کیوں ہوا۔ اس کے دو اسباب بالکل واضح ہیں اولاً یہ کہ فرد یا ایک چھوٹی سی ٹیم کے ساتھ تمام زبانوں کے ادب کا احاطہ بڑا طول عمل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فی الحال چند بنیادی اور اہم ہندوستانی ادبیات کا اس جہت سے اس لیے انتخاب عمل میں آیا ہے کہ ہندی

کی دوہری حیثیت مسلم ہے یعنی قومی کے ساتھ ہماری سرکاری زبان بھی ہے نیز اردو کی ماں جائی بہن ہے ۔تازہ مردم شماری کے لحاظ سے اردو کو کہ ملک کی چھٹی سب سے بڑی زبان ہے مگر اس کا علاقہ ہندی سے بھی وسیع تر ہے ۔انگریزی اسلیے کہ یہ نہ صرف ایک بین الا قوامی زبان، قیمتی تخلیقی سرمائے کی حامل، ہندوستان کی جملہ زبان وادب سے اخذ واستفادہ کے ساتھ انہیں گہرائی سے متاثر کرنے والی اور آج بھی ملک کی عملی اور تخلیقی ضروریات کی تکمیل کا ایک بڑا ذریعہ ہے ۔سنسکرت اسلیے کہ انگریزی اور فارسی سے بھی پہلے یہ زبان ملک کی تمام زبان وادبیات کی ماں اور اسکی زمین کی حیثیت سے آجتک بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔

ہندوستانی خاندان السنہ میں آریائی زبانوں کی طرح دراوڑی نسل کی مختلف زبان وادب کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے ۔با الفاظ دیگر آریائی خاندانی السنہ میں جو اہمیت سنسکرت کو حاصل ہے وہی اہمیت دراوڑی خاندان السنہ میں تامل کی ہے ۔لہذا اسکا تحقیقی مطالعہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

تحقیقی طریق کار کا منصوبہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ مذکورہ پانچوں زبانوں کی اہم ترین شعری ونثری تخلیقات کا تفصیلی وتحقیقی مطالعہ کر کے ان کے فکر وفن کی بنیادی قدروں کو یوں مرتب کیا جائے کہ ان کی مماثلتیں، تنوع اور گہرائی وگیرائی واضح ہو جائیں ۔تخلیقات کے انتخاب میں دو اصول وضع کیے گئے ہیں اولاً یہ کہ اہل نظر کے خیال میں وہ اس ادب کی نمائندہ تخلیق ہوں دوم یہ کہ ہر ادب کے چار شاہکار منتخب کیے جائیں ۔دو شاہکار (شعر +نثر) کلاسیکی عہد کے ہوں اور دو عہد جدید کے۔

اس طریق کار کی روشنی میں تحقیق کا خاکہ اس طرح بنتا ہے:۔

پروجکٹ کا خاکہ

☆تعارف۔

☆اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور تامل ادبیات کے چار شاہکاروں کے انتخاب کا معیار ومیزان۔

☆شاہکار تخلیقات کی فکری بنیادیں۔

☆ان تخلیقات کے فنی محاسن۔

☆ان کا باہمی تقابلی مطالعہ۔

☆تقابلی مطالعہ کے نتیجے میں مشرقی ومغربی تخلیقی قدروں کے باہمی فرق وامتیاز اور مشترکہ اقدار کی نشاندہی۔

☆موجودہ صورتحال۔

☆مستقبل کے امکانات۔

☆حاصل مطالعہ۔

مطالعہ کی معنویت

اس مبسوط مطالعہ کی معنویت واہمیت میں اضافہ کے مندرجہ ذیل نکات قابل لحاظ ہیں:۔

(1) ہندستان عہد قدیم سے آج تک مغرب کے برعکس بحیثیت مجموعی حیات وکائنات کے کلی نقطۂ نظر کا حامل رہا ہے۔اس لحاظ سے یہاں کے ادب العالیہ میں ہمارے فنکار بالعموم خدا، کائنات اور انسان کے رشتوں کو ایک وحدت میں پرو کر وتجیدی عمل کو مہمیز اور احساس جمال کو تخلیق سے ہم آمیز کرتے رہے ہیں۔

(2) یہاں کے ادباء وشعرا نے مادہ پرستانہ جبریت واشتہاریت یا سرمایہ دارانہ استحصال و استکبار کی جگہ بیشتر ارضیت کے ساتھ مادرائیت، اخلاق کے ساتھ روحانیت اور ظاہر کے ساتھ باطن کے حسین امتزاج کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

(3) تاریخ کے بعض ادوار میں فکری زوال اور عملی انتشار نے یہاں کے فکر وفن کو منفی انداز میں بھی متاثر کیا ہے جن کے تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ سے حال ومستقبل کے تخلیق کاروں کے

لئے عبرت کا وافر سامان بھی مہیا ہو سکے گا۔

(4) ان ادبیات کے درمیان اگر کسی نے مکمل کیا تو غالباً پہلی بار یہ ایک مبسوط تقابلی و تحقیقی مطالعہ ہوگا۔

معاشرتی ضروریات اور موضوع کی اہمیت

اس وقت پوری دنیا کی طرح ہندوستان بھی مغربی فکر و فن سے براہ راست متاثر ہے اور مغربی فکر کی یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ اپنی بعض خوبیوں کے باوجود نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی ادب میں روحانی احیا کی لہر سے جو فکری انتشار پیدا ہوا اس پر آج تک قابو نہیں پایا جا سکا ۔ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے لفظوں میں "ہوشمندی کے انقطاع کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی ہم کبھی بھی اصلاح نہ کر پائے"۔ کیونکہ انسان پرستی اور عقلیت زدگی نے بتدریج ہر قسم کے انحراف و فساد کے دروازوں کو چوپٹ کھول دیا چنانچہ تجزیہ کار عقل کو لگام دینے والی جب کوئی قوت سامنے نہیں رہی تو اکابرین مغرب کے سائنسی علم (Scientific knowledge) اور مطالعہ کے نام نہاد قطعی طریقوں (Exact Method) کے نام پر انسان کی عظمت و فضیلت کو میکانیت اور نامیت بلکہ غیر نامی مادہ میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اور جزوی تجربات، فروعی استنباط اور فارمولہ سازی کی ایک ایسی وبا پھیلی کہ اس نے ما بعد الطبیعاتی، اخلاقی اور انسانی تصور کے علاوہ جملہ علوم و فنون کو بھی نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔ یہ مادہ پرستانہ رجحان جب اپنے منطقی انجام کو پہنچا تو نصف صدی کے اندر اندر دو جنگ عظیم، ایٹمی ہلاکت خیزی کے بعد اشتراکیت اور بہت سی ازموں کو بھی الٹ کے رکھ دیا۔ ایک مغربی مفکر تو چیخ اٹھا کہ:۔

"وحشت اور بربریت کامیاب ہوگئی ہے اور ہماری فطرت کے درندہ صفت عناصر نے اپنا نقطۂ نظر ہم سے منوالیا ہے۔"

چنانچہ ڈی۔ایچ۔لارنس جو انسانی تعلقات کے ادب کی موت کا اعلان کر چکا تھا

،ادب کی حیات نو کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اب کوئی نیا اور جاندار ادب ہوگا تو وہ انسان اور خدا کے باہمی رشتے کے بارے میں ہوگا اسلئے مشرقیوں کو اسکا مشورہ یہ ہے کہ مشرق، مغربی ادب کو پہلے اپنے اندر جذب کرے اور پھر اپنا راستہ خود ڈھونڈے۔

اس عالمی وملکی تناظر میں زندگی جس یکرخاپن کا شکار ہو کر جبریت، قنوطیت، نسل پرستی، علاقہ پرستی، طبقہ واریت، لوٹ کھسوٹ اور دہشت وہشت کی زد میں ہے۔ متوازن ادبی نقطہ نظر کی بازیافت کا یہ مطالعہ یقیناً ملکی وعالمی تناظر میں سودمند ثابت ہوگا۔

علم ودانش میں ممکنہ اضافہ:۔

اس موضوع پر تحقیق کے نتیجے میں توقع ہے کہ موجودہ ادبی منظرنامے میں:

(1) تفردپسندی، بیزاری، قنوطیت اور منافقت کی جگہ اتحاد ویکجہتی، رجائیت اور تہذیبی قدروں پر ازسرنو ہمدردانہ غور وعمل کے لیے تخلیق کاروں کو ابھارا جاسکے گا۔

(2) زندگی کی موجودہ میکانیکیت سے قومی مزاج میں جو خشکی اور یکرخاپن پیدا ہو چکا ہے اسمیں اعتدال وتوازن کی ایک خوشگوار راہ راست کی نشاندہی کی جاسکے گی۔

(3) ادب کی جمالیاتی اور اخلاقی قدروں کی بڑھتی ہوئی خلیج کو کم سے کم کرنے میں سہولت نصیب ہوگی۔

(4) ادب کو حسن، خیر اور صداقت کی لطیف نمائندگی کا ایک نیا میدان عمل دستیاب ہوگا۔

(5) زبان وادب اور علاقائی بعد وتفاوت کے باوجود ان کے درمیان مفاہمت کی ایک نئی اور خوشگوار لہر پیدا ہو سکتی ہے۔

(6) ادب میں فنی روایات کے ساتھ فکری اجتہادات اور فنی تجربوں کی حوصلہ افزائی کی فضا ہموار ہوگی۔

اردو زبان وادب کے فروغ وارتقا میں اسلامی تہذیب کا کردار

اردو ہی پر منحصر نہیں دنیا کی جملہ زبان وادب کے فروغ وارتقا میں مختلف مذاہب نے اپنے اپنے انداز سے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں تمام محققین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ مسلم تاجر، مبلغین، صوفیائے کرام اور فاتحین اپنے ساتھ عربی وفارسی کے علاوہ ترکی اور پشتو وغیرہ زبانوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں کی مختلف علاقائی بولیوں (اپبھرنشوں) سے صدیوں تک خلا ملا کے نتیجے میں اردو یا ریختہ کھڑی بولی، ہندی، ہندوی، ہندوستانی یا اردوئے معلی کے نام سے موجودہ اردو زبان وادب کی تشکیل عمل میں آئی۔

یہ بھی سچ ہے کہ اسلام کے علاوہ ہندو، بودھ، جین دھرم اور صوفی سنتوں کے علاوہ بعد کے دور میں مغربی فکر وفلسفہ کے مثبت ومنفی اثرات سے بھی اردو نے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا۔ مگر بحیثیت مجموعی اسلامی تہذیب کا کردار غالب وکارآفریں رہا۔ مگر یہ زبان مذہبی تنگ نظری کا شکار کبھی نہ ہوئی۔ ملک میں پچھلی صدی سے اردو کے خلاف آج تک جو تعصب وتنگ نظری پائی جاتی ہے اسکی ایک بڑی وجہ غالباً یہی اسلامی اثر ہے۔ اردو کے خلاف اس منفی فضا میں مسلمانوں کی فکری وعملی کم مائیگی وکوتاہی کے علاوہ برادران وطن کی چند در چند غلط فہمیوں کا بھی دخل ہے۔

ہزار سالہ ربط وتعلق کے باوجود مسلمان باشندگان ملک پر یہ واضح نہ کر سکے کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں بلکہ حضرت آدمؑ تا حضور اکرمؐ تصور توحید، رسالت اور آخرت کے تسلسل کی آخری کڑی ہے۔ تمام ہی الہامی مذاہب نے توحید کو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ یہ الیہ الگ ہے کہ بعد کو ان مذاہب کے پیروؤں نے نفاق،

تفریق وتشکیک، کفر وشرک، تقلید جامد، آباپرستی اور مختلف رسم ورواج وغیرہ کے ذریعہ تہذیب وتخلیق کے سب سے اہم سوتے کو خشک کیا۔ کیونکہ توحید خالص کے بغیر انسانی توجہ اور قوت حیات کبھی ارتکاز حاصل نہیں کرپاتیں اور کبھی آمیز ہوکر ایک اکائی نہیں بن پاتیں جو تخلیق کی شرائط میں سے ایک اہم شرط ہے۔ اسی لیے سولزے نیتسن نے کہا تھا کہ

''منافق آدمی کسی عظیم تخلیق کا اہل نہیں ہوسکتا''

وجہ ظاہر ہے کہ ذات واحد کی اطاعت فرمانبرداری (ثم ھدیٰ طٰہٰ ۵۰) کی رو سے دنیا کی ہر شئے جیسی کچھ بنی ہوئی ہے، اسی کے بنانے سے بنی ہے، ہر چیز کی جو بناوٹ، جو شکل وصورت، جو قوت وصلاحیت اور صفت وخاصیت حاصل ہے، اسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ اسی لیے خلق الانسان (رحمٰن ۳) کے ذریعہ انسان کو پیدا کرکے چھوڑ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان علینا الھدیٰ (لیل ۱۲) یعنی ''رہنمائی کرنا ہماری ذمہ داری ہے''۔ یعنی انسان کو موزوں ترین ساخت ہی نہیں دیا گیا بلکہ نظام فطرت میں اسے اپنے حصے کا کام کرنے کے قابل بنایا۔ اور اس کام کو انجام دینے کا طریقہ بھی اسے سکھایا۔ خود انسان کے اپنے جسم کا ایک ایک رونگٹا اور ایک ایک خلیہ (Cell) وہ کام سیکھ کر پیدا ہوا ہے جو اسے انسانی جسم میں انجام دینا ہے۔ اسی لیے یہ بھی جتا دیا گیا کہ وعلی اللہ قصد السبیل ومنھا جائر (نحل آیت ۹) ''یہ اللہ کے ذمہ ہے کہ سیدھا راستہ بتائے جب کہ ٹیڑھے راستے بہت ہیں''۔

<u>لسانی وصف:</u> قادر مطلق نے انسانی زبان وبیان اور تخلیق وتنقید کے لیے بھی کچھ بنیادی اصول وضع کردیے ہیں۔ فرمایا علمہ البیان (رحمٰن آیت ۴)۔ اصل میں لفظ بیان استعمال ہوا ہے جس کے ایک معنی مافی الضمیر کے ہے یعنی بولنا اور اپنا مطلب ومدعا بیان کرنا، اسی بیان میں احساسات وجذبات اور تخیل وادراک کو شامل کردیا جائے تو یہی تخلیقی اظہار بن جاتا ہے۔ اس لفظ بیان کے دوسرے معنی ہیں فرق وامتیاز کی وضاحت (تنقید وتحقیق اور

تفحص وابلاغ بھی) جس سے مراد اس مقام پر خیر وشر اور بھلائی اور برائی کا امتیاز ہے۔ بولنا وہ امتیازی وصف ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری مخلوقات سے ممیز کرتا ہے۔ یہ مخصوص قوت گویائی وتحریر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے عقل وشعور، فہم وادراک، تمیز وارادہ اور دوسری ذہنی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ جن کے بغیر انسان کی قوت ناطقہ کام نہیں کرسکتی۔ اس لیے بولنا یا تخلیق کرنا دراصل انسان کے ذی شعور اور ذی اختیار مخلوق ہونے کی صریح علامت ہے۔ اس امتیازی وصف کے سبب انسان کی تعلیم کی نوعیت وہ نہیں ہوسکتی جو بے شعور اور بے اختیار مخلوق کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ لہٰذا انسان کا دوسرا اہم ترین امتیازی وصف یہ ہے کہ خالق نے اس کے اندر ایک اخلاقی حس (Moral Sense) رکھدی ہے، جس کی وجہ سے وہ فطری طور پر نیکی اور بدی، حق اور ناحق، ظلم اور انصاف، بجا اور بیجا کے درمیان فرق کرتا ہے اور یہ وجدان اور احساس انتہائی گمراہی وجہالت کی حالت میں بھی اس کے اندر سے نہیں نکلتا۔ ان دونوں امتیازی خصوصیات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کی شعوری و اختیاری زندگی کے لیے تعلیم وتخلیق کا طریقہ اس پیدائشی طریق تعلیم سے مختلف ہو جس کے تحت مچھلی کا تیرنا اور پرندے کا اڑنا اور خود انسانی جسم کے اندر پلک کو جھپکنا، آنکھ کو دیکھنا، کان کو سننا اور معدے کو ہضم کرنا سکھایا گیا ہے، انسان خود اپنی زندگی کے اس شعبے میں، استاذ اور اسکول ومدرسے اور تبلیغ وتلقین اور تحریر وتقریر اور بحث واستدلال جیسے ذرائع ہی کو وسیلۂ تعلیم مانتا ہے اور پیدائشی علم وشعور کو کافی نہیں سمجھتا۔ لہٰذا جیسی مخلوق ویسی تعلیم وتربیت اور طریقۂ تخلیق کی صنعت ودیعت کردی گئی ہے۔ اس لیے جو "بیان" مخلوق کو سکھایا گیا ہے، اس کے لیے "قرآن" جیسا نسخہ شفا ہر میدان اور ہر وصف انسانی کی جلا کے لیے موزوں ترین ثابت ہوا۔

<u>حسن اور خیر:</u> حسن کی تخلیق میں ترتیب وتوازن کے ساتھ سقراط کے لفظوں میں، حسن خیر کا ہم معنی اور اخلاقیات سے مربوط نیز حسن مطلق ہی اصل حقیقت اور قائم بالذات ہے، بے

مثل و بے عدیل ہے، تمام محاسن کا سرچشمہ ہے۔ اسی حسن مطلق کے مشاہدے اور ادراک کا نام بھی علم ہے۔ یہ علم خیر ہے اور یہی حیات انسانی کا مقصود حقیقی ہے، چنانچہ سقراط کے شاگرد افلاطون نے اپنے نظام افکار میں تصور یا عین (Idea) یا نظریہ عینیت کو بنیادی اہمیت دی۔ اس فلاسفہ کی اشراقیت اور بعد کے اضافے یا تحریفات و ترمیمات نے یونانی فلسفہ اور اس سے متاثر مغربی فلسفہ نے مادیت والحاد اور خدا بیزاری کا جو رخ اختیار کیا اس نے تصور حسن و جمال اور تخلیق و تنقید کو خاصا گمراہ کیا جس کا شدید احساس متعدد مغربی مفکرین و تخلیق کاروں کو ہوا۔ مشہور دانشور، ادیب و شاعر اور ناقد ٹی ایس ایلیٹ نے تو واشگاف کہا کہ:

> ''میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سارا کا سارا جدید ادب لادینیت کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے اور وہ فطری زندگی کے مقابلے میں فوق الفطری زندگی کی اہمیت و تقدیم سے ناواقف و بے خبر ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جسے میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں'' (ایلیٹ کے مضامین: مذہب اور ادب، ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۲۳۵)

مغرب کے برعکس مشرق یا ایشیائی ممالک بالخصوص ایران و ہندوستان نے تصوف و عبادت میں غلو کر کے فنافی الروح کے تصور کو فروغ دیا تو پورا خطہ سلبیت کا شکار ہو کر رہ گیا۔

اس کے مقابل حقیقی الہامی یا قرآنی فکر نے یہ نہیں کیا کہ انسان کو محض علم و عقل کی قوتیں دیکر چھوڑ دیا بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کون سا اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سورہ بلد کے الفاظ میں **وھدینہ النجدین** ''اور ہم نے اسے دونوں راستے (خیر و شر) نمایاں کر کے بتا دیے'' سورہ شمس میں یہی بات مزید واضح کی گئی **ونفس وما سوھا۔ فالھمھا فجورھا وتقوھا** ''اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اس ذات کی

جس نے اسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) استوار کیا، پھر اس کا فجور اور اس کا تقویٰ دونوں اس پر الہام کر دیے"۔ "راستہ دکھانے" سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ذیل میں محض چند مثالوں پر اکتفا کیا جا رہا ہے:۔

(۱) ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی حس بھی دی گئی ہے۔

(۲) ہر انسان کے اندر خالق حقیقی نے ضمیر (نفس لوامہ) نام کی ایک چیز رکھدی ہے جو اسے ہر برے بھلے وقت ٹوکتی اور خبردار کرتی رہتی ہے۔ کیونکہ اس قوت کو ہزار کوشش کے بعد بھی فنا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فطری محاسب کا کام کرتا ہے جو اتنا جاندار ہے کہ کسی برے انسان سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ سورہ قیامہ کے الفاظ میں "انسان اپنے آپ کو خوب جانتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے (آیت ۱۴۔۱۵)

(۳) عرش تا فرش، انفس و آفاق ساری کائنات میں الٰہ واحد کی نشانیاں اور قیامت و آخرت کے دلائل بھی اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر ثبت کر رکھے ہیں۔

(۴) انسان کی اپنی زندگی، ہم عصر دنیا اور ماضی میں تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے رہے ہیں جن سے ایک قادر مطلق کی بالاتر حکومت اور ساری کائنات پر اسکی فرمانروائی اور ہر چیز پر مشیت کے غلبہ نیز تجربات و مشاہدات نہ صرف خارج بلکہ داخل اور باطنی زندگی میں بھی اس بالاتر وجود کی شہادت دیتے رہتے ہیں کہ سارے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ کر ایک ہی معبود کو پکارا جائے۔

(۵) انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ نیکی اور خیر کا انعام دیا جائے اور برائی اور شر کے جرم پر سزا دی جائے۔ غرض اخلاق اور قانون مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ مگر اس دنیائے دنی میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خیر کا بدلہ شر سے اور شر کا بدلہ بظاہر خیر سے دیا گیا۔ لہذا تصور

آخرت کے بغیر چارہ نہیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ آخر ہزاروں انسانوں کی زندگی سنوار دینے والے کو دنیا والے کیا انعام واکرام دے سکتے ہیں۔ اس کے برعکس سیکڑوں کے قاتل کو دنیا کی کون سی عدالت عالیہ پوری پوری سزا دینے کی اہل ہے۔ الا آخرت کے۔

(۶) ان تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے صریح اور واضح رہنمائی کے لیے انبیاءؑ بھیجے اور کتابیں نازل کیں تا کہ شکر اور کفر کی راہیں صاف معلوم ہوں۔

<u>کتاب اور صاحب کتاب:</u> اسی لیے کہا جاتا ہے کہ علم وادب اور تہذیب وسیاست میں حقیقی انقلاب لانے کے لیے دو چیزوں کی بطور خاص ضرورت پڑتی ہے اولاً کتاب اور دوم صاحب کتاب۔ حضورؐ کے بارے میں تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ وہؐ چلتا پھرتا قرآن تھے اور قرآن پاک ہی انسانی تہذیب کا بے مثال توازن پیش کرتا ہے۔ بعض غیر الہامی مگر اہم کتابوں نے جزوی صداقت کی روشنی میں انسان اور انسانیت کو بڑی گہرائی سے متاثر کیا ہے اس ضمن میں مارکس کی داس کیپٹل ہو یا ماؤ کی ریڈ بک کرنل قدافی کی گرین بک ہو یا مولانا رومی کی شاعری ''ہست قرآں در زباں پہلوی'' علامہ اقبال نے شاید اسی لیے کہا تھا کہ

؎ تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

تاریخ بھی شاہد ہے کہ مذہبیات کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی بنیادی کتابوں ہی نے آج دنیا کا نقشہ اور اسکو مٹھی میں قابو کر رکھا ہے۔ اسی لیے شاعر مشرق نے یہ تلقین کی ہے کہ ساری دنیا کی تہذیب وترقی کا سبب کتاب اور فقط کتاب ہے لہذا کتاب خوانی کے ساتھ اس کی تفہیم اس طرح ہو کہ متن ومواد کو محسوس اور جذب کر کے خود کچھ نیا تخلیق کریں۔ لہذا سنجیدہ قاری کے دل میں مطالعہ کی بھوک ہمیشہ تازہ دمی چاہیے۔ اس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ

معلوم کو محسوس کر سکے کیونکہ ''کتاب'' حال ہی نہیں ماضی کی امین اور مستقبل کا اشاریہ بھی ہے۔اس کے ذریعہ آسمان کی بلندی کو چھوا جا سکتا ہے اور سمندر کی گہرائی کو ناپا جا سکتا ہے۔ کتاب ہی دل و دماغ اور روح کی آگہی کا ذریعہ ہے۔

اسلامی تہذیب کی اساس بھی ''کتاب و سنت'' ہی پر مستحکم ہے۔کتاب (قرآن مجید) اگر اس کا نظری پہلو ہے تو سنت اسکا عملی پہلو ان دونوں نے مل ہی کے ''مسلم تہذیب'' کو ''انکشاف و ایجادات'' کی تہذیب بنا دیا۔اسی بنیاد پر مسلمانوں نے دنیا میں علم کی سب سے بڑی روایت قائم کی اور سب سے بڑے مذہب کا علمی خزانہ اور شاعری کی سب سے بڑی کائنات تخلیق کی۔سائنس و ٹکنالوجی کی دنیا میں محیر العقول کارنامے انجام دیے۔لہذا مسلمان اگر آج بھی اپنی علمی میراث سے جڑ جائیں تو دنیا ان کی قیادت کو تسلیم کر سکتی ہے کہ بیسویں صدی جو مختلف قسم کے سیاسی تجربات اور ازموں کے بعد جس نو سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو اکیسویں صدی میں بجبر و اکراہ دنیا بھر پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ بالفعل ''ہجومی نظام'' میں تبدیل ہو کے انسانی و اخلاقی قدروں ہی کو پامال نہیں کر رہا ہے بلکہ حیات و کائنات کے عناصر ترکیبی ہی کو مسخ و تباہ کرنے پر آمادہ ہے۔اس لیے ساری دنیا ایک نئے نظام کی متلاشی ہے۔قتل و غارتگری اور تمام اقدار حیات کو پامال کرنے والے نظام نے اگر تقویٰ اور علم کی بنیاد پر بارہ سو سالہ اسلامی قیادت کا اندازہ کر لیا کہ آئندہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کیوں کہ امت مسلمہ، امت وسط بھی ہے اس لیے دنیا کی تقدیر مسلمانوں کی تقدیر سے وابستہ ہے۔

<u>قرآنی اثرات:</u> قرآن مجید کا دیگر الہامی کتابوں کی طرح ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ اپنے پاکیزہ تر موضوع و مواد کی طرح اس کی زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت بھی آج تک نہایت متاثر کن اور فنی حسن و جمال سے آراستہ ہے۔اگر غور کیا جائے تو قرآن پاک اصلاً تین باتوں کی دعوت پیش کرتا ہے۔

(۱)توحید (۲) آخرت (معاد) اور (۳) رسالت

مگر انہی تین چیزوں کو مختلف انداز سے بار بار اس طرح دہرایا ہے کہ ہر جگہ یہ مستقل اور نیا مضمون معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر عقیدۂ توحید کو لیجئے۔ قرآن کہیں اسے انسانی فطرت کی پکار کہتا ہے، کہیں دل کی آواز، کہیں شرک کے خلاف، کہیں تمام انبیاء کی مشترکہ دعوتی اساس کہیں مشرکین کے اپنے نفس کی شہادت سے استدلال، کہیں موت یا تباہی آنے پر بناوٹی معبودوں کے بجائے رب کائنات سے مدد کی پکار اور کہیں خدا کے بے شمار احسانات، اسکی بے پایاں نعمتوں کے تذکرہ سے جذبۂ عبودیت کو ابھیز کرنا وغیرہ۔

اسلوب بیان اور فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو صاحب "قرآن مبین کے ادبی اسالیب" کے بقول قرآن جوامع الکلم اور فصاحت و بلاغت نیز ربط و نظم کے اعتبار سے ایسا بے بدل نمونہ ہے کہ عرب کے فصحا و بلغا اور ملک الشعرا بھی اسکی ایک سورہ کے برابر کوئی سورہ لانے کے چیلنج کو قبول نہ کر سکے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کا یہ اسلوب نحو و بلاغت کے قواعد و ضوابط سے نہ پرکھا جائے بلکہ قرآن کے اسلوب اور استعمالات کو سامنے رکھ کر فن نحو و بلاغت کو از سر نو تشکیل دیا جائے۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ قرآن کا اسلوب تکرار، تخلیص (گریز)، تخاطب، عود الی البدء، تضمین، حذف، تنکیر و تعریف، تکمیل و تقابل، تجنیس و مشاکلت، قسم و تعریف اور دوسرے تمام اسالیب ادب اور بلاغت کے اس مقام پر ہیں جہاں تک انسانی ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ کمال یہ ہے کہ یہ تمام اسالیب جاہلی کلام میں مستعمل ہیں، لیکن قرآن کا ادب نرالا اور انوکھا ہے۔ مثال کے طور پر "قسم" کو لیا جائے، دور جاہلیت سے آج تک مختلف مواقع پر قسم اس لیے کھائی جاتی ہے کہ مقسم علیہ کی تاکید ہو سکے اور مخاطب کے شک و شبہ کو دور کیا جا سکے۔ ویسے علم بلاغت کی کتابوں میں قسم کی ادبی لطافتوں اور فوائد پر کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا۔ علامہ ابن قیمؒ کے علاوہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام اور خاص کر مولانا فراہی نے اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ قرآن میں قسمیں نہایت

اہم امور پر لگائی گئی ہیں مثلاً توحید، قیامت اور رسالت وغیرہ پر۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی نے قسموں پر مفصل بحث کے بجائے صرف ایک اسلوب کی حیثیت سے اس پر مجمل اشارے کے دوران علامہ فراہی نے قسم کے جو آٹھ فوائد بتائے ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ نیز قرآن کے ادبی اسالیب کے صرف ۱۹ نکات سے پوری کتاب (کل صفحات ۲۰۸) میں بحث کی گئی ہے۔

"گویا بحرِ ذخار میں سے چند قطرے اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں پورا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آسکتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ ع ہر قطرہ دریا میں ہے دریا کی گہرائی"۔

اور اختتام ان الفاظ پر کیا ہے:

"یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک ماضی میں معجزہ تھا، حال میں معجزہ ہے اور مستقبل میں قیامت تک کے لیے معجزہ رہے گا اور یہ اعجاز اس کے ادب، اس کی بلاغت، اس کے نظم و ترتیب، اس کے معنی و مطالب، اسکی نغمگی و صوتی ہم آہنگی، اس کے جمال و جلال، اس کی پیشین گوئیوں اور غیبی انکشافات اور اس کی سائنسی ایجادات و اختراعات کی طرف اشاروں، غرض کہ ہر جہت، ہر پہلو سے اور ہر میدان میں نمایاں ہے" (ص ۱۸۸)

محققین کے خیال میں ایام عرب میں ادبی اسالیب تین قسموں تک محدود تھے مسجع عبارت، اشعار اور رجز یہ قصاید۔ مگر قرآن نے ان میں بڑی وسعت اور تنوع پیدا کر دیا۔ ملا محمد عبدالعظیم زرقانی نے اسلوب قرآن کی یہ چھ خصوصیات بتائی ہیں:۔

(۱) قرآن کا لفظی آہنگ، جو اس کے صوتی نظام اور نحوی جمال سے مرکب ہے۔

(۲) عوام و خواص دونوں کے لیے تسلی و تشفی والا ہے۔

(۳) عقل اور جذبہ دونوں کو مطمئن کرنے والا ہے۔

(۴)احکام وقوانین کے بیان میں ربط ونظم ہے۔

(۵)تصریف۔یعنی ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھا گیا ہے۔

(۶)اجمال وتفصیل ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

عربی شاعری:اس کے برعکس ایام عرب کی تخلیقات میں بالعموم ابہام،عدم وضاحت قبائلی عصبیتوں کی دخل اندازی،جنس زدگی،جھوٹ،مبالغہ بلکہ غلو اور فخر ومباہات کے ساتھ ولولہ انگیزی،جذبات نگاری اور منظر کشی کو نمایاں کیا جاتا تھا۔

اسلام کا مقصد چونکہ معاشرہ کی اصلاح اور کردار سازی ہے اس لیے مذہبی اقدار،قبائلی اقدار سے مزاحم ہوئے۔ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے اپنی تصنیف ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت''(ص ۳۱) میں ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا ہے جس میں اس عہد کی مروجہ شاعری پر اسلام کے ردعمل کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

> ''اسلام میں عربی شاعری کے ذہنی رجحانات پر ضرب لگائی۔قرآن مجید نے شعرا کو ان کی بے راہ روی پر متنبہ کیا کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو خود نہیں کرتے۔حضورؐ نے فرمایا کہ ''ایسے شعر سے بہتر ہے کہ آدمی قے سے اپنا پیٹ بھرے''۔شعرا کی پیروی کرنے والوں کو گمراہ قرار دیا گیا لیکن ان ارشادات کا مطلب یہ تھا کہ عربوں کو فحش شاعری،عورتوں کے جسمانی محاسن،شراب کی تعریف اور جوئے کی مدح سے روکا جائے اس لیے کہ اسکا بڑا مقصد خیالات واخلاق کی پاکیزگی تھی،پاکیزہ شاعری کو حضورؐ خود پسند فرماتے تھے اور اسلام کی مدافعت میں انہوں نے اس سے کام بھی لیا۔آپؐ نے قصاید میں جو تشبیب ہوتی تھی،اس کو بھی سنا اور اعتراض نہیں فرمایا''۔(ص ۳۱)

قرآن پاک کی سورۂ شعرا سے شاعروں کے بارے میں یہ چند باتیں عموماً حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔اس آیت کو اگر پورے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو یہ اس طرح ہے:

"(اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے) کیا میں تم کو بتلاؤں کہ کن لوگوں پر شیاطین اترا کرتے ہیں۔ایسے لوگوں پر جو پہلے سے دروغ گو اور بدکردار ہیں،اور جو (شیطانی باتیں) سننے کے لیے کان لگا دیتے ہیں۔اور کثرت سے جھوٹ بولتے ہیں۔اور شاعروں کی راہ تو گم کردہ راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔وہ (شاعر) خیالی مضامین کے ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں۔اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔ہاں مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور انہوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا شکر ادا کیا۔اور انہوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے بدلہ لیا"۔

<u>اقداری ادب:</u> یعنی قرآن نے مثبت اخلاقی قدروں پر اصرار کیا ہے اور متقی ذہن والوں کی مخالفت کی ہے قرآن کی ادبی منشا کو نکتہ وار اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ادب و شاعری کے مقاصد صالح ہوں (۲) شاعر کو اپنے تخیل پر لگام اور خود کو کسی اخلاقی نظام کا پابند اور فکری بے راہ روی سے احتراز کرنا چاہیے۔

(۳) قول و فعل میں ہم آہنگی اور ربط ہو۔

اسلام نے شاعری کے برے عناصر کی نشاندہی کرنے کے بعد اسی لیے آگے استثنا بھی کیا ہے۔قرآن آگے کہتا ہے کہ "مگر وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور عمل صالح کرتے ہیں اور شاعری کو ذکر خدا یا شکر خداوندی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور مظلوم بن کر خاموش نہیں بیٹھے رہتے۔ایسے شاعروں پر قرآن کو کوئی اعتراض نہیں۔قرآنی منشا یہ بھی ہے

کہ ظلم و جور پر احتجاج اور اس کا تدارک کیا جائے۔ رسول کریمؐ اور اصحابؓ رسول پر ہجو کوئی کا سلسلہ حد سے بڑھ گیا تو حضرت محمدؐ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ "تم بھی ان کی ہجو کرو اور فکر نہ کرو اس لیے کہ تمہارے ساتھ حضرت جبرئیل روح القدس ہیں"۔

کفار و مشرکین کا منہ توڑ جواب اور قدغن لگانے کے لیے نبی کریمؐ نے تین شعرا کا ایک گروپ بنایا تھا جس میں حسان ابن ثابتؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور کعب ابن مالکؓ شامل تھے اور جس کے سربراہ حضرت ابوبکرؓ مقرر کیے گئے تھے۔ حضورؐ ان کے علاوہ خنسا کی شاعری کو بھی پسند کرتے تھے البتہ "خبیث اور عمدہ کلام" کی تفریق پر سخت تھے۔ ایک بار حضورؐ نے حسب فرمائش شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ "مومن تو اپنی تلوار سے بھی جنگ کرتا ہے اور زبان سے بھی"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی "عمدہ اور صحیح کلام" میں فرق کرتی تھیں۔

<u>عہد بعہد ارتقا:</u> بہر حال قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت اور اقداری ادب و اسلوب نے عربوں کے فکر و فن کی کایا پلٹ دی۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کا دور اندرونی فتنوں اور خلفشار کو سر کرنے میں گزر گیا۔ البتہ خلافت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتوحات کا سلسلہ دراز ہوا اور امن و خوشحالی آئی تو شعر و ادب کو پھر فروغ حاصل ہوا۔ حضرت عمرؓ زہیر کو اپنے عہد کا سب سے اچھا شاعر اس لیے سمجھتے تھے کہ وہ معاظلہ (مبہم قافیہ) اور غلو و مبالغہ سے کام نہیں لیتا تھا، وہ اسلام کی بنیادی اخلاقیات کا تتبع کرتے ہوئے صدق گوئی کو پسند فرماتے تھے اور شاعری کی پرکھ میں گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اسی لیے ابن رشیق نے حضرت عمرؓ کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا نقاد بتایا ہے۔ امراءالقیس کی شاعری کے بارے میں ان کا یہ قول قابل ذکر ہے کہ

"اس نے شعر کے چشمے سے پانی نکالا اور اس نے ان مضامین کو بینا کر دیا" (بحوالہ مشرقی شعریات ص ۳۶، از کتاب العمدہ ص ۵۹)

حضرت عثمانؓ کا زمانہ کو قدرے عدم استحکام کا تھا پھر بھی ان کے بالیدہ ذوق

شعری کے سبب شعرا کا ایک حلقہ ان کے گرد رہتا۔ وہ شاعری سننا پسند فرماتے تھے۔ العقد العربی القدیم کے مصنف داؤد سلوم کے حوالے سے یہ واقعہ مرقوم ہے کہ آپ بطور خاص ابو زید الطائی کے کلام کو پسند فرماتے تھے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شاعر نے ان کی محفل میں خلیفہ کو شیر کے اوصاف سے متصف بتلایا تو شرکائے محفل اس سے مرعوب ہونے لگے مگر ان پر دوسرا ہی ردعمل ہوا کہ انہوں نے اس شاعر کو خاموش رہنے کا حکم دیا"۔

حضرت علیؓ بھی امراء القیس کی ندرت بیانی اور برمحل شعر گوئی کی وجہ سے اسکی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے۔ مگر اس کی غیر اخلاقی شاعری سے متنفر۔ کیونکہ رسول کریمؐ کے اس قول محکم کے وہ پیروکار تھے کہ "ھو اشعر الشعرا و قائدھم الی لنار "یعنی امراء القیس شعرا میں سب سے بلند مرتبت شاعر ہے مگر وہ شاعروں کو جہنم کی طرف لے جانے والا بھی ہے۔ یعنی کوئی اخلاقی اعتبار سے پست ہے تو اس کو مذہبی اعتبار سے کم مرتبہ قرار دیتے ہیں مگر جب اسی شخص کو فنی طور پر باکمال پاتے ہیں تو اس کے فنی مرتبے سے انکار نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں "شاعری قول اقوم کا پیمانہ ہے"۔ وہ شاعری کو انسانی معاشرہ کی شناخت اور زمانے کی صورت حال کا عکاس قرار دیتے تھے۔ صدر اسلام میں قرآن نے اظہار کے لیے حسن، متانت اور حکمت و موعظت پر ہمیشہ زور دیا۔ بعد میں بھی ماہرین اسلامی علوم نے ان خوبیوں کو بطور خاص اہمیت دی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ معروف اسلامی اسکالر اور اردو کے محقق و نقاد نے قرآن کریم میں اس نوع کے بیانات کا نچوڑ اس طرح پیش کیا:۔

"قرآن مجید نے اظہار میں تین چیزوں پر خاص زور دیا ہے۔ (۱) قول حسین (۲) قول متین (۳) قول سدید۔ اور حکمت اور موعظت اور ادبی اظہار میں حسن، متانت، معنوی و لفظی پختگی و تحکیم، علم افروزی اور اخلاق آموزی کہ عناصر کے سرچشمے یہی ہیں"۔ (مشرقی شعریات ص ۳۹)

غرض ابتدا سے اخلاقی قدروں کے ساتھ ادبی اقدار کو قابل لحاظ سمجھا گیا۔ اسی لیے محققین اس امر میں متفق ہیں کہ عہد اسلام میں ادبی شعور کی کارفرمائی عہد جاہلیت کے مقابلے میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ عہد اموی سے اخلاقی اقدار میں گراوٹ، خاندانی، قبائلی اور نسلی عصبیت جسے اسلام نے مٹانے کی سعی کی، انہیں دوبارہ بڑھاوا دیا گیا۔ اس لیے دور جاہلیت کی فنی روایتوں کو دوبارہ زندہ کیا جانے لگا۔ ہجو گوئی جسے صدر اسلام میں معیوب سمجھا گیا تھا اموی دور میں بعض شاعروں کی پہچان بن گئی۔ مثلاً جریر، فرزدق اور اخطل وغیرہ۔ چنانچہ اس عہد (پہلی صدی ہجری) میں شعر و ادب پر نحوی، صرفی اور لغوی مسائل کو ترجیح حاصل ہوگئی۔

عہد عباسی کو عربی ادب کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اس دور میں لغوی و نحوی مباحث کو وسعت دی گئی۔ شعرا کی شخصیت، ماحول اور شاعری کی ہیئت اور اس کے اسلوب پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی۔ دور جاہلیت سے اپنے عہد تک کے شعرا کے تذکرے ان کے کلام کی تدوین و تحقیق اور تنقید کے قابل ذکر مجموعے مرتب کیے گئے۔ بالخصوص ابن سلام کے طبقات الشعرا، ابن قتیبہ کے الشعر والشعرا اور ابن معتز کے طبقات الشعرا وغیرہ۔

اقسام شعر: ابن قتیبہ نے ماضی اور روایت کی پاسداری کے باوجود شعر کی پرکھ میں، شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار کو زیر بحث لانے سے انکار کیا ہے۔ اس کا مشہور قول ہے کہ:

"شعر کو اس کی اپنی قیمت کے لحاظ سے پرکھنا چاہیے نہ کہ شاعر کی شخصیت کی بنا پر (ایضاً۔ ۴۷)

ابن قتیبہ نے شعر کی چار قسمیں بتلائی ہیں جن سے لفظ و معنی کے تہدار حقائق پر اس کی مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے:

(۱) جس کے الفاظ اور معنی دونوں اچھے ہوں۔

(۲) جس کے الفاظ تو عمدہ اور شیریں ہوں مگر جب غور سے دیکھا جائے تو وہ

شعریت سے عاری ہوں اور اسکے پس پشت کوئی نئی بات یا اچھوتا خیال نہ پایا جاتا ہو۔

(۳) جس کے معنی تو اچھے ہوں مگر الفاظ ان کی ادائیگی پر پورے طور پر قادر نہ ہوں۔

(۴) جس کے الفاظ و معنی دونوں ہی کم رتبہ ہوں۔ (ایضاً۔۴۸)

تصوف واخلاق: عربوں کی تخلیقی وتنقیدی روایات نے پہلوی کے بعد فارسی شعر وادب کو اساسی طور پر منقلب کر کے رکھدیا۔ ایران کی مقامی بولیوں کے علاوہ اوستائی اور پہلوی زبان وادب کو فارسی زبان وادب کی شکل دے دیا۔ ترجمان البلاغہ اور قابوس نامہ (امیر عنصر العالی کیکاؤس پانچویں صدی ہجری کی کتابیں) نے رشید الدین وطواط کی مشہور زمانہ کتاب "حدائق السحر فی دقائق الشعر" کو بڑی گہرائی سے متاثر کیا۔ فارسی کی مثنویات، قصاید کے علاوہ نثری تخلیقات میں قصص و حکایات، داستان اور صوفیا کے ملفوظات وغیرہ کے گراں قدر خزانے پر اگر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو عجمی تاریخ وتصوف کے اثرات پر اسلامی تہذیب وثقافت کے زیر اثر اخلاقی اقدار کا غلبہ واضح ہے۔ ان اثرات کی تفصیل کے لیے محققین وناقدین مندرجہ ذیل بنیادی کتابوں کا بکثرت حوالہ دیتے ہیں۔

چہار مقالہ از ابو الحسن احمد السمرقندی ملقب بہ نظامی عروضی۔ لباب الالباب (سال تصنیف ۶۱۸ھ، از محمد عوفی)۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم از شمس الدین محمد بن قیس رازی۔ معیار الاشعار از فلسفی ومتکلم خواجہ نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ)۔ معیار جمالی ومفتاح ابو اسحاقی از شمس الدین فخری اصفہانی۔ حدائق الحدائق از شرف الدین محمد تبریزی (متوفی ۷۹۵ھ) شرح حدائق السحر فی دقائق الشعر از رشید الدین وطواط۔ رسالہ در "علم قافیہ" اور رسالہ "فی العروض" از عبد الرحمن جامی (متوفی ۸۹۹ھ)۔ سبک ہندی کے شعرا وناقدین میں عبدا کبری کے ابو الفضل اور فیضی کے بعد "دبیر عجم" از اصغر علی روحی وغیرہ پر فرداً فرداً فکر وتحقیق اور مفصل تنقیدی مطالعہ ہنوز باقی ہے۔ اردو زبان وادب کے فروغ و

ارتقا میں مذکورہ بالا عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں کی حکایت لذیذ کے علاوہ یونانی و سنسکرت ادبیات اور مغربی افکار و جمالیات کی حصہ داری بھی بالکل واضح ہے۔اسلامی تہذیب کے عالمی و آفاقی مزاج کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی ہر خوبو سے اخذ و استفادے میں اپنی اساسی قدر توحید و تقویٰ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ غیر اسلامی عناصر کو اخذ کرتے وقت بعض مقامات پر تھوڑی سی چوک کے باوجود بحیثیت مجموعی انہیں اپنے رنگ میں رنگ کے چیزے دیگر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

<u>سنسکرت و یونانی جمالیات:</u> اردو کی دکنی ادبیات نظم و نثر اور شمال کے کلاسیکی تخلیقات میں سنسکرت جمالیات کی کارفرمائی کا تفصیلی مطالعہ قاضی جمال حسین (جمالیات اور اردو شاعری) نے پیش کیا ہے۔سنسکرت جمالیات میں بھرت منی کی ''ناٹیہ شاستر'' کے فلسفہ ''رس'' کا معاملہ ہو یا آنند وردھن کا نظریہ صوت یا دھونی کا نظریہ استعاراتی معنی ہی کلام کی روح اور اس کا جوہر ہے۔مذکورہ 'رس' کے فلسفہ انبساط کو ماہرین نے 'معرفت' کی ایک شکل قرار دیا ہے یعنی 'رس' ہی نعوذ باللہ خدا ہے، یہی 'رس' روحانی مسرت و انبساط کا مترادف ہے۔اسی طرح اچاریہ کنتک نے نظریہ ''وکروکتی'' کے ذریعہ جو شعری بنیاد فراہم کی وہ یہ ہے کہ ''صنعتوں کا خوشگوار ابہام، عام پیرایۂ اظہار سے انحراف، جدت اور ندرت کلام'' تخلیق کی روح ہیں۔

''رس ہی خدا ہے'' یا ''معرفت'' کی ایک شکل ہے۔افلاطون حسن اور حق کو ہم معنی سمجھتا تھا اور اسکا شاگرد معنوی افلاطونس (۲۰۴۔۲۷۰) یونانی مابعد الطبیعاتی اور متصوفانہ اشراقی فلسفی کے فلسفہ کی بنیاد اس عقیدے پر تھی کہ ''اللہ تعالیٰ حسن اور نور کا سرچشمہ ہے اور وہی انسانی زندگی کا مقصود اور حقیقی غایت ہے'' (ص ۴۹) مغرب کا کلاسیکی دور بحیثیت مجموعی فکر و فن کی روحانی تعبیر و تشریح پر یقین رکھتا تھا مگر آگے چل کر پاپائیت اور مذہبی کٹر

پسندی کے ردعمل میں بتدریج مسیحی عقائد پر مادی والحادی افکار نے غلبہ حاصل کرلیا۔ کانٹ نے تو احساسات کے فلسفیانہ توجیح وتحقیق کو ہی جمالیات سے تعبیر کردیا۔ جو آج تک برقرار ہے۔

اس کے برعکس اپنیشد میں حسن کی دو علامتوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، ایک تو نور یا بجلی اور دوسری علامت ہے نشاط وانبساط۔ اظہار کی سطح پر حسن ایک نور ہے اور احساس کی سطح پر نشاط یا سرشاری (ص ۵۹) غرض تمام تر لفظی واستعاراتی باریک بینی کے باوجود سنسکرت اور ہندی روایات میں تہذیب وثقافت کو متصوفانہ نقطہ نظر ہی سے پیش کیا گیا ہے۔

اصلاح مغرب: یہی صورت مغربی کلاسیکی ادب وتہذیب کی تھی۔ مگر پچھلے تین سو سالہ دور میں الحاد ومادہ پرستی کو مذہبی کٹرپسندی اور استحصالی رویے نے پنپنے کا بطور خاص موقع دیا جس کے تلخ ثمرات آج ساری دنیا میں جاری وساری ہیں۔ مگر پچھلی صدی میں متعدد سائنس داں اور فلسفیوں کی تلاش حق اور نتائج فکر نے انہیں مادہ (Matter) کے بجائے تصور (Idea) اور شعور (mind) کو موضوع بحث بنانے پر مجبور کیا ہے۔ زمیکس پلانک (جرمنی) کے نزدیک اصل حقیقت (Reality) شعور ہے۔ بقول جیمز جینس "مادہ شعور سے ماخوذ ہے" آئن اسٹائن کے خیال میں بھی نفس اور شعور اساسی حقیقتیں ہیں۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے مختلف سائنسی نظریات مثلاً "تھرموڈائنامیکس"، "نظریہ اضافیت" (Theory of Relativity) "نظریہ قدر" (Quantum Theory) نے دوبارہ ملحد و مادہ پرستانہ نظریہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ الحادی سائنس کے لیے تیسرا دھماکہ ۱۹۲۶ء میں ہائزن برگ کے اصول غیر یقینیت (Uncertainity Principle) کے سبب ہوا۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ کسی شے کی بابت ہمارے علم کی بھی ایک حد ہے۔ چنانچہ انفس و آفاق کی لامحدود وسعتوں میں جھانکنے کے بعد اب تو آر۔ ان۔ اے (R.N.A.)، ڈی،

ان ، اے (D.N.A.) اور ہیومن جینیوم کے بعد "گوڈ پارٹیکلس" (God Particles) تک رسائی نے الحادی و مادی تعبیر و تاویل کی گنجائش کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کر دیا ہے۔ اب تو مابعد الطبیعات کا یہ عقیدہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ تخلیق بغیر شے کے ہوئی کیونکہ ایک سائنسی تخمینہ کے مطابق کائنات میں مادے کی کل مقدار صفر آتی ہے۔ قرآنی نقطہ نظر 'کن فیکون' اور 'علم قلیل' کا اعتراف 'بلیک ہول' اور کائنات کی لامحدود وسعت پذیری کے ذریعے مغربی فلسفوں میں شوپن ہار (جرمنی) کے خیال میں آفاقی ارادہ (Volunterism) ہی حقیقت اولیٰ ہے اور برگساں کے نزدیک تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ "صاحب تخلیق" صاحب شعور اور صاحب ارادہ ہو۔ یہ جو عظیم الشان پیمانے پر عمل تخلیق جاری ہے اس کے پس پردہ "جذبہ تخلیق" (Elan Vital) کام کر رہا ہے۔ ڈریش (جرمنی۔ Driesche) نے مادی کائنات میں کارفرما قوت کو "روح" (Entelechy) سے تعبیر کیا۔ غرض فلسفیانہ مباحث کے نتائج معکوسی (Preposterous)، سائنسی اصول تصدیق کی "خود تردیدی" (Self Refuting) وغیرہ کے تضادات سے نجات پانے کے لیے بیسویں صدی کی سائنس اور نام نہاد دانشوری نے "نیچرل سائنس" کے دامن میں پناہ لی تو نیچرل سائنس خود ہمہ دم وجود پذیر سراب اور معمہ کی شکار ہو گئی۔ وہ معمہ یہ ہے کہ نیچرل سائنس کے پاس ایسا کوئی ذریعہ علم نہیں جس سے وہ یہ جانے کہ وہ جو جانتی ہے اور جو نہیں جانتی ہے دونوں میں باہم کیا تناسب ہے؟ آج کی سائنس اپنے "ادراکی افق" (Cognitive Horizon) کے سحر میں گرفتار ہونے کی وجہ سے اس کے پاس درست (True) اور نادرست (False) کو برابر کے لیے متعین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ آج جو کچھ ہمارے ادراکی دائرے میں ہے اور درست مانا جاتا ہے، کل یا آئندہ وہ نادرست ہو جائے گا یا اس کے برعکس جو نادرست ہے کل درست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا موجودہ معلومات "حقیقی" نہیں بلکہ "قبول کردہ سچائی" ہے

جو آئندہ کسی لمحے میں بھی جھوٹی اور بے حقیقت ثابت ہو سکتی ہے۔

متغیر نظریات: ع ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات۔ جیسا کہ اوپر کی چند نئی دریافتوں کے تذکرے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔

فکر و نظر کے ان تغیرات و حقائق نے بیسویں صدی کے آواخر تک آتے آتے فلسفیوں، سائنسدانوں اور دانشوروں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو گئی جس کے پیش کردہ نظریات سائنس پرستی کی نفی کرتے ہیں اور اس کے سخت مخالف ہیں۔ ان میں پانچ تو نوبل انعام یافتہ ہیں مثلاً الیکسس کیرل (۱۹۴۴ء۔۱۸۷۳ء)، میکس پلانک (۱۹۴۷ء۔ ۱۸۵۸ء)، آندرے ژید (۱۹۵۱ء۔۱۸۶۹ء)، الگزنڈر سولژنیتسن (۱۹۸۱ء) اور بورس لیونو ووچ پاسترناک (۱۹۶۰ء۔۱۸۹۰ء) آخر الذکر کو اس کے ناول "ڈاکٹر ژواگو" پر ۱۹۷۰ء میں ادب کا نوبل انعام ملا مگر قبول کرنے سے اسے انکار کرنا پڑا۔ سولژنے تیسن اور آندرے ژید کو بھی بالترتیب ۱۹۷۰ء اور ۱۹۴۷ء میں ادب کے نوبل انعام ملے۔ الیکسس کیرل کو ۱۹۱۲ء میں میڈیسن اور میکس پلانک کو ۱۹۱۸ء میں فزکس سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ اس فہرست میں جارج ایوانوچ (۱۹۴۹ء۔۱۸۷۸ء)، پیٹر آسپنسکی (۱۹۴۷ء۔۱۸۷۸ء)، ولیم جیمز (۱۹۱۰ء۔۱۸۴۲ء)، آئن اسٹائن (۱۹۵۰ء۔۱۸۷۹ء)، جارج برناڈ شا اور عظیم فلسفی رینے گیوں (Guenon) وغیرہ کے نام نامی بھی شامل ہیں۔ آخر الذکر بعد کو مسلمان ہو کر شیخ عبدالواحد عیسیٰ کہلائے۔ ان سب میں قدر مشترک کی حیثیت سائنس پرستی کی مخالفت اور مادہ پرستی سے انکار کے ساتھ مذہبی فکر یا روحانیت پر اعتقاد ہے۔ یہ سب کے سب ایک ایسے مذہب کو مانتے رہے جو یقینی طور پر سائنس سے برتر اور بالاتر ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے اپنی کتاب "مستقبل کی تاریخ پر ایک نظر" میں لکھا ہے کہ:

"یہ بات عجیب و غریب اور فکر انگیز اتفاق ہے کہ الیکسس کیرل، میکس پلانک اور آئن اسٹائن کی تحریروں میں جابجا دین فطرت کی تعبیرات ملتی

ہیں"۔

جارج کوری ایف کا قول ہے کہ

"سائیکولوجی نے انیسویں صدی میں ۱۹۸ قوانین وضع کیے لیکن موجودہ صدی کا علم نفسیات ان میں سے کسی قانون کو نہیں مانتا"۔

میتھ میٹکس (Mathematics) کے فرانسیسی ماہر شوارز کا کہنا ہے کہ:

"انیسویں صدی میں فزکس کے ماہرین کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کا جواز پیش کر سکتے ہیں، لیکن آج ماہرین طبیعات کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ انہیں ابھی تک مادے کی خاصیت کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ بالآخر یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی"۔

اکیسویں صدی کس کی؟ بقول علی شریعتی:

بیسویں صدی میں آکر سائنس اتنی عاجز کیوں ہوگئی؟ اس کی پچھلی صدیوں کا غرور کیا ہوا؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں ایک نیا دور آنے والا ہے، مذہب کا دور۔ ایک ایسا مذہب جو ہر طرح موجودہ سائنس سے بہتر اور برتر ہوگا، جو دنیا کو ایک فطری نظام کا پابند بنا کر اسے امن اور انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح سے وہ ظلم اور دہشت گردی سے آج بھری ہوئی ہے"۔ (اردو بک ریویو۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۳ء۔ ص ۱۲۔ عالم نقوی)

قرآن پاک نے شاید انہیں حقائق کی ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ پیشگوئی کر دی تھی کہ

سنریھم ایٰتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق۔

ترجمہ: "عنقریب ہم ان کو نفس انسانی کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنے نشانات دکھائیں گے" (یعنی ان کی نفسیات طبیعات اور حیاتیات کے بعض حقائق سے آشنا کریں گے، حتیٰ کہ ان پر ثابت ہو جائے گا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے)

کائنات کی اصل حقیقت: پچھلی صدی سے اب تک کی علمی تحقیقات اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ کائنات کی اصل اور آخری حقیقت ایک شعور (Consciousness) ہے یعنی مادہ حقیقی نہیں بلکہ شعور حقیقی ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ یہ شعور خود شناس اور خود شعور ہو اور تمام جمالی وجلالی صفات کا مالک ہو، حکما کی اصطلاح میں اس قسم کے شعور کو خود شعوری (Self-Consciousness) کہا جاتا ہے، قرآن نے اسے اللہ اور رحمٰن کہا ہے۔ کائنات کی صورت میں خود شعوری عالم کے تخلیقی کارنامے یہ بتا رہے ہیں کہ وہ فقط ایک شعور یا ایک قوت مدرکہ نہیں بلکہ ایک قہرمان تخلیقی قوت ہے، جو قدرت مطلقہ کی مالک ہے جو حی وقیوم ہے اور خود بخود حیات اور زندگی ہے چنانچہ اس خود شعوری کے بارہ میں قرآن کی تعلیم یہی ہے۔

لا الٰہ الا ھوا الحی القیوم۔ "اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ اور قائم ہے"۔

ھو اللہ الخالق الباری المصور۔ "وہ اللہ ہے خالق اور باری اور معبود ہے"۔

لہ الاسماء الحسنیٰ۔ "تمام اچھی صفات اسی کی ہیں"۔

ھو الرزاق ذوالقوۃ المتین۔ "وہ رازق ہے اور بڑی طاقت کا مالک ہے"۔

یہی خود شعوری ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا جو اسے ارتقا کی منزلوں سے گذار رہی ہے اور جس نے اپنے آپ کو ایک طویل ارتقائی عمل سے انسان کے قالب میں پھونک کر اسے خود شعور کر دیا ہے اور جو اس طرح سے جسد انسانی میں زیادہ سے زیادہ جلوہ گر ہو کر مسجود ملائک بنتی جا رہی ہے۔

فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعو له سٰجدین ۔"جب میں اسے مکمل کرلوں اوراپنی روح اس میں پھونک دوں تو (اے فرشتو) اس کے سامنے سجدے میں گر پڑنا"۔

جب انسان کی خودشعوری اپنے کمال کو پہنچے گی تو فرشتوں کا سجدہ بھی مکمل ہوگا اور وہ پھونک بھی مکمل ہوگی۔جس نے کائنات کے ارتقائی عمل کی صورت اختیار کی ہے اور جس سے خدا اپنی روح کو انسان کے قالب میں پھونک رہا ہے۔چونکہ انسان کی اصل انسان کا شعوریا خودشعوری ہے اسی لیے اقبال نے اسے اورمختصر کر کے خودی کہا تھا،لہذا ہم اسے فلسفۂ شعور،فلسفۂ خودشعوری یافلسفۂ خودی کہہ سکتے ہیں۔

جذبۂ حسن (Urge for Beauty) یا آدرش (نصب العین) خودشعوری کا خاصہ ہے لہذا خودشعوری جہاں ہوگی اس میں یہ خاصہ موجود ہوگا۔اگر انسان کی خود شعوری آدرش سے محبت کرتی ہے تو کائنات کی خودشعوری بھی آدرش سے محبت کرتی ہے،خدا کا آدرش انسانیت کاملہ ہے اور انسان کا آدرش خدا ہے۔محبت کا دوسرا پہلو نفرت ہے،خود شعوری اپنے آدرش سے محبت کرتی ہے لیکن ان تمام چیزوں سے نفرت کرتی ہے جو اس کی محبت کے راستہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔قرآن نے اللہ تعالیٰ کے وصف محبت کو رحمت کا نام دیا ہے،یہ وصف نفرت پر سبقت رکھتا ہے اور کائنات کی ہر چیز پر حاوی ہے۔

ان رحمتی سبقت علیٰ غضبی ورحمتی وسعت کل شیء۔"میری رحمت میرے غضب پر سبقت رکھتی ہے،میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے"۔

صفات جلال وجمال خودشعوری کی محبت کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔چونکہ خودشعوری انسان کے اندر بھی ہے اس لیے محبت اور نفرت اور صفات جلال وجمال انسان کے اندر بھی موجود ہیں اور یہ صفات ارتقا کے عمل سے دن بدن زیادہ سے زیادہ نمودار اور آشکار ہوتی جارہی ہیں،چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے:تخلقو اباخلاق

اللہ۔ ''اللہ کے اوصاف سے اپنے آپ کو متصف کرو''۔ یہی سبب ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی معرفت کا مکلف بنایا ہے اور اسے اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ اگر ہمارے اندر خدا کی خود شعوری یا اس کی روح کا ایک عکس نہ ہوتا تو ہم خدا کو پہچان نہ سکتے بلکہ اس کی عبادت بھی نہ کر سکتے، خدا کو پہچاننے کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے، اسی لیے صوفیا کو قول ہے: من عرف نفسه فقد عرف ربه۔ ''جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا''۔ خود خداوند تعالیٰ نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اس کا عرفان حاصل کرنے کے لیے جہاں تم کائنات کا مطالعہ کرو وہاں اپنے آپ کو بھی آنکھیں کھول کر دیکھو۔ کیونکہ تمہاری خود شعوری یا تمہارے نفس کے اندر بھی معرفت حق کی راہ نمائی کا سامان موجود ہے۔

آدمی دیدہ است باقی پوست است دیدہ آں باشد کہ دید دوست است (رومی)

وفی الارض ایات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون ۔ ''اور خدا کی ہستی پر یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں نشانات ہیں اور نفس انسانی میں بھی، کیا تم نہیں دیکھتے؟ (بحوالہ قرآن اور علم جدید از ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔ ص ۲۵۳ تا ۲۵۶۔ طبع پنجم۔ اسلامی اکادمی لاہور)

باطل کی یلغار: محبت و نفرت، جلال و جمال اور تعمیر و تخریب کی طرح حق و باطل کی کشمکش بھی ازلی و ابدی ہے، چنانچہ پچھلی صدی کے اوائل تک مختلف مذاہب کے درمیان آویزشیں جاری تھیں مگر پچھلی دو تین صدیوں میں باطل نے مغربی الحاد و مادہ پرستی کی فلسفیانہ تعبیر و تشریح کے ذریعہ حق کے خدا پرستانہ تصورات پر جو منظم اور چو طرفہ حملے شروع کیا ہے، اس نے خدا پرستوں کی صفوں کو تقریباً درہم برہم کر دیا ہے۔ چنانچہ متشککین و مرتدین کی تعداد روز افزوں ہے۔ اس دفعہ باطل نے مذہب کے بجائے فلسفہ کا لباس پہن کر حملہ کیا ہے، جس کے سامنے روایتی پرانے مذہب نے تقریباً سپر ڈال دیا ہے اب اس کے نشانے پر براہ راست اسلام ہے جسے کفر جدید مٹا ڈالنے کے درپے ہے مگر اسلام کا نام لیے بغیر وہ علمی تحقیق اور عقلی

استدلال کے مل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے جس میں خدا، رسول اور دین کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک نظریہ ہے۔ وہ عقیدہ اور سند علم اور عقل کی بنیاد پر رد کر کے صرف قدرت اور اسکے نا قابل تغیر و تردید قوانین کے نام پر لامذہبیت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ہر قوم اپنی سیاسی زندگی کو جو بالآخر اس کی ساری زندگی کا محور ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی فلسفہ کی بنیادوں پر خود کو استوار کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ کارل مارکس کی سوشلزم ایک فلسفہ ہے، جس کی بنیاد پر کمیونزم، ہٹلر کی نازی ازم یا کروچے کی فلسفہ پر مبنی مسولینی کی فاشزم، میکیاویلی کی نیشنلزم، امریکہ اور نیٹو کے وابستہ یورپی ممالک کی نوسرمایہ دارانہ جمہوریت وغیرہ نے ترقی، آزادی، حقوق انسانی اور نام نہاد مساوات وغیرہ کے نام پر ڈیڑھ ہزار سالہ انسانی تاریخ کی اس سکڑتی سمٹتی دنیا میں امریکہ کے اتحادی انتہاپسند صہیونی و صلیبی اور کفر و شرک نے متحدہ محاذ بنا کر دہشت گردی کے نام پر اسلام کے خلاف پچھلی دو تین دہائیوں سے عملاً عالمی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ اسلحہ جاتی جنگ کے ذریعہ عراق، افغانستان، شام و شیشان وغیرہ کے علاوہ میڈیا کارپوریٹ پروپیگنڈہ اور سرمایہ کی مدد سے فکری و نفسیاتی جنگ کے ذریعہ سارے جہاں کے علاوہ بالخصوص عالم اسلام کو منافقت و بداخلاقی کے سیلاب بلا میں غرق کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے لفظوں میں:

فکر و عمل کا تضاد:

> "اس وقت نفاق ہمارا حقیقی دشمن ہے جو خود ہمارے اندر چھپا ہوا ہے، تعصب ہماری نظر ہے جس سے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، ناانصافی ہمارا مزاج ہے جس پر ہم چل رہے ہیں اور منافقت و ریاکاری ہمارا کردار ہے جس سے ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ منافقت کے معنی ہیں قول و فعل کا تضاد یعنی جو کہا جائے وہ کیا نہ جائے اور جو کیا جائے وہ کہا نہ

جائے ایک صورت تو یہ ہے۔ دوسری تشویشناک صورت یہ ہے کہ ہمارا عملی آدمی اور ہمارا فکری آدمی، عمل اور خیال کی سطح پر الگ الگ ہو گئے ہیں۔ یعنی سرا لگ دھڑا لگ، فکر و عمل کے اس رشتے کے ٹوٹ جانے سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ اچھی سے اچھی بات اور مفید و بہترین خیالات سے عملی آدمی بے خبر اور بے نیاز ہے اور ان سے الگ ہو کر اپنے فیصلے کرتے رہتا ہے۔ اس طرح ''فکر'' رائے عامہ کی تشکیل یا زندگی کے عمل سے کٹ کے رہ گئی ہے۔ فکر و خیال کوئی ککڑی کی بیل تو ہے نہیں کہ رات بھر میں گز بھر بڑھ جائے۔ وہ تو قدم قدم آگے بڑھتے ہیں اور اس معاشرے میں بڑھتے ہیں جہاں اسے اہمیت دی جاتی ہے، جہاں اسے رد یا قبول کیے جانے سے پہلے توجہ سے سنا جاتا ہے اور جہاں اس کے متعلق رائے عامہ کی تشکیل سے عملی آدمی کی فکر اور فیصلوں سے باقی رہتا ہے''۔ (ادب، کلچر اور مسائل۔ ص ۳۰۳۔۳۰۴۔ بحوالہ آمد ۸)

؎ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

<u>خیر و شر کی محفوظ لہریں:</u> مذکورہ بالا باطل قوتیں حتی الوسع پچھلی تین صدیوں میں برسر اقتدار آ کر حق اور سچ کی مسلسل دریافتوں کو اپنے پیسے اور پروپیگنڈے کی قوت سے پنپنے یا ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ سیاسی سطح پر الجزائر، یمن، لیبیا، تیونس، مصر اور عرب ملکوں کی سیاسی ''بہار'' کو جمہوریت، آزادی اور انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں نے جس کھلی دھاندلی اور بے رحمی سے کچل کے اس کا رخ موڑا ہے وہ سب آج کے حقائق ہیں۔ اسی طرح فکر و نظر اور تہذیب و ثقافت کی جہت سے بھی جو نت نئے حقائق ظہور پذیر ہو رہے ہیں انہیں نظر انداز کر کے حاشیے پر ڈال دینے کی کوشش ہوتی رہتی ہے۔ بعض شواہد کا ذکر آچکا

ہے۔یہاں پر ''خیر وشر کی محفوظ لہروں'' کا اجمالی ذکر کیا جارہا ہے۔اب عالمی سطح پر یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ ہمارا ہر اچھا یا برا قول وفعل، سوچ، فکر نیت و ارادہ تک اپنا ایک 'لہری وجود'(Wave Form) رکھتا ہے، جوفضائے بسیط میں کہیں محفوظ ہوتا جارہا ہے(کہیں یہی ہمارا نامۂ اعمال تو نہیں؟) جسم سے باہر بقدر شدت وقوت جسم سے خارج ہونے والی تمام توانائیاں لہری شکل میں اپنا ایک حلقہ اثر قائم کرلیتی ہیں، جسے ہم اس شخص کا برقاطیسی توانائیوں کا ''ہیولا یا لہری ہمزاد'' بھی کہہ سکتے ہیں (مثلاً ECG اور تھرمامیٹر وغیرہ) یہی ہیولا ''اولیاءُ الرحمٰن'' میں روحانی قوت بن کر معجزات وکرامات دکھاتا ہے اور ''اولیاءُ الشیطان'' میں یہی ہیولا منفی اثرات کے ساتھ استدراج بن جاتا ہے۔نہ جانے کتنے قدیم زمانے سے دیومالائی دیوتاؤں، صالحین اور ہیروز کے مجسموں اور تصویروں میں ان کے سروں کے گرد ایک روشن ہالہ بنایا جاتا رہا ہے۔ توانائی کے اس علاماتی (Symbolic) اظہار میں اس قدر تواتر وتسلسل بلا وجہ نہیں ہے۔اسے Aurara یا Aura کہتے ہیں۔اس میں اور ہمارے نورانی برقاطیسی ہیولے میں کچھ رشتہ تو ہے(ڈاکٹر غلام کبریا خاں کا مقالہ ''حکمت صف'' سے ماخوذ اردو سائنس ماہنامہ دسمبر ۱۳ء۔نئی دہلی ص ۶۔۵)

اس طرح کی سائنسی وروحانی صداقتیں اور اسلامی تہذیب وثقافت کے تصور توحید، رسالت وآخرت کے نتیجے میں فکر ونظر میں جو انقلاب برپا ہوتا ہے بالعموم مادیئین و ملحدین اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

<u>اردو کی ہمہ گیری:</u> اردو زبانی کے آغاز وارتقا کی لسانی تاریخ خاصی منفرد اور دلچسپ ہے۔ مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ اردو سنسکرت کے بطن سے پیدا ہوئی مگر فارسی اور عربی کے خون اور گوشت وپوست سے اسکی نشو ونما ہوئی۔اس لیے اس کا مزاج خدا پرستانہ واخلاق مندانہ کے علاوہ، رویہ صلح کل اور توازن واعتدال کی وجہ سے ابتدا ہی سے یہ مختلف السانی وکثیر

تہذیبی عناصر کو باہم جوڑنے اور ہم آمیز کرنے کی بہترین صلاحیت کی حامل رہی ہے۔ **لااکراہ فی الدین، لکم دینکم ولی دین، کل اٰمن باللہ.....لانفرق بین ایدیھم** وغیرہ آیات کی روح اس کے سوا اور کیا ہے۔اس لیے شروع ہی سے یہ ایک لسانی طاقت کے طور پر ابھری۔اسے ابتداً صوفی اور سنتوں نے پریم اور پریت کی علامت کے طور پر اپنایا اور سلاطین نے اپنے درباروں کی رونق بڑھائی۔مقامی زبانوں کے ساتھ مل کر ابتداً فارسی، عربی اور بعد میں پرتگیزی اور انگریزی اثرات کے تحت عوامی زبان کی حیثیت سے قومی تہذیب کے فروغ میں استعمال ہونے لگی۔اس قومی تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں ہندو، مسلمان، بودھ، جین، سکھ، پارسی اور مسیحی سب کی مشترکہ کوششوں کا دخل ہے۔اسلام کے تصور توحید و مساوات اور آفاقیت نے کھڑی بولی کے سانچے میں اردو ایک جوڑنے والی زبان کی حیثیت سے ابھری جو آج بھی شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں رابطہ کی زبان اور Cementing Force کا رول ادا کرتی ہے اور قومی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔واضح ہو کہ قومی تہذیب علاقائی تہذیب نہیں ہوتی کیونکہ قوم کسی ایک مذہبی گروہ یا اس کی علاقائی تہذیبی روایات کی بھی پاسداری نہیں کرتی۔بنگالی، پنجابی، مراٹھی اور دیگر علاقائی زبانیں اپنی اپنی ریاستوں کی تہذیبی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن اردو سارے ہندوستان کی مشترکہ قومی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔تقسیم ملک کے بعد اردو کے ساتھ سوتیلے پن کے بے رحمانہ سلوک اور تعصب و تنگ نظری کے باوجود لسانی آداب، تہذیب و شائستگی اور معیار و وقار کے اعتبار سے اردو کی ہر دلعزیزی ملک گیر پیمانے پر ظاہر و باہر ہے۔سچ پوچھیے تو لسانی، سیاسی و جغرافیائی طور پر منتشر اور مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ملک کو مسلم دور حکومت ہی نے منظم و مربوط کیا۔مشہور دانشور اور وزیر تعلیم وی، کے، آر، وی، راؤ کے لفظوں میں:

"ہندی، ہندو مذہب کی نمائندگی کرتی ہے، اس کے برعکس اردو ایک

خالص سیکولر زبان ہے"۔(ماہنامہ صدائے اردو مارچ ۱۴ء۔ص ۵)

آزادی کے ۶۵ سال کے دوران ہندی کے فروغ میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود اسے قبول عام کا درجہ نہ مل سکا آخر کیسے ملتا۔ملاحظہ ہو ایک ہندی دانشور کی زبان کی تازہ مثال:

"نمیکھا بیٹھک۔سی ایم کی دس دبھاگوں کی نمیکھا۔دن بھر چلی میر وتھن بیٹھک۔ورپے ادھیکاریوں کو مانیٹرنگ کا زدیش۔دبھاگ پیچوں کو فیلڈ ویزٹ کرنے کا نردیش، یوجناؤں کو پراتھمکتا کے استر پر نپٹائیں"۔(روزنامہ پربھات خبر رانچی ۵رجون ۱۴ء۔ص ۸)

چنانچہ کئی جنوبی ریاستوں میں ہندی کے خلاف تحریکیں برپا ہوئیں۔تھک ہار کے اردو کے کندھوں پر سوار ہو کر ہندی جنوب میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔اردو کے سینئر پروفیسر اور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے بقول:

"جتنی طاقت اور توانائی اردو نے سرکاری زبان ہندی کو عطا کی ہے وہ قومی تہذیب کے فروغ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے"۔(جدید قومی تہذیب میں اردو کی اہمیت)

ذرائع ابلاغ،میڈیا اور فلموں کے ذریعہ آج بھی اردو ہی کا بول بالا ہے۔خواہ مہر ہندی یا ہندوستانی کی لگائی جائے۔حد تو یہ ہے کہ قومی ترانوں میں آج بھی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" سے زیادہ مقبول کوئی دوسرا ترانہ نہیں۔مہاتما گاندھی بھی اس ترانے کو بہت پسند کرتے تھے۔جدوجہد آزادی میں ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دہلی اردو اخبار،الہلال والبلاغ،ہمدرد وغیرہ نے جو کلیدی رول ادا کیا ہے اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔وجہ ظاہر ہے کہ اردو نے اپنا دامن کھلا رکھا ہے،تنگ نظری اور خالصیت پسندی سے اس نے خود کو باز رکھا چنانچہ صوتی،صرفی،لفظی اور معنیاتی سطحوں پر

اردو نے دوسری زبانوں کے اثرات فراخدلی سے قبول کیے جس نے اس کے دامن کو فصاحت وبلاغت اور اظہار وابلاغ کی توانائی سے بھر دیا۔ معنوی اعتبار سے اردو میں اسلام دوستی، خدا پرستی، اصلاح پسندی اور اخلاقی اقدار نے تصوف، خیر پسندی اور انسانیت دوستی کے حوالے سے ہر دور میں اردو ادب کو متحرک اور مائل بہ ارتقا رکھا ہے۔

معیاری ادب کی خصوصیات: اسی روایت کے پیش نظر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک موقع پر معیاری اور موثر ادب کی چھ خصوصیات کی نشاندہی کی تھی۔ یعنی تعمیری ادب میں (۱) ابتذال نہ ہو (۲) زبان عام فہم ہو (۳) وسعت معلومات کے ساتھ (۴) پختگی فکر بھی ہو، مزید یہ ہے کہ اس میں (۵) خلوص کے ساتھ (۶) فکر وعمل میں ہم آہنگی بھی ہو، غرض اسلامی تہذیب وثقافت نے مندرجہ ذیل معنوی محاسن سے اردو ادب کو برصغیر کے تمام زبان وادب کے درمیان ممتاز وموقر مقام عطا کیا:

(۱) توحید وتقویٰ کے زیر اثر سلامتی فکر ونظر

(۲) اخوت ومساوات اور آفاقی انسانی اقدار کا پاس ولحاظ

(۳) تحرک وانقلاب آفرینی

(۴) ارتکاز واخلاص

(۵) سلبی ومنفی کے بجائے رجائی وایجابی رجحان کی عمومی پذیرائی

(۶) بلند نگہی وارتقا پذیری۔

تعمیری ادب کا مایہ خمیر: چنانچہ اردو نے ثقافتی وروحانی اعتبار سے عوام کے جذباتی وجمالیاتی تسکین کا ہمیشہ سامان فراہم کیا اور ہر دور میں زندگی کے منفی یا خالص مادی وحیوانی نقطۂ نظر کے برخلاف حیات وکائنات کے مثبت اور اخلاق مندانہ تصورات کے زیر اثر آگہی، بصیرت، لازمانیت، ایمان اور عشق سے لبریز تخلیقات سے اپنے دامن کو مالامال کیا۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جن سے متصف ہو کر اقبال نے اپنے پورے دور کو فکری وفنی

اعتبار سے سب سے زیادہ متاثر کیا۔انہوں نے دیگر شعرا کے مقابلے میں کائنات کے حرکی تصور اور اسلام کی تسخیر و تازگی، برق تابی و شعلہ نوائی، بلند نگہی و سخت کوشی، روشن بینی و جہاں بانی، حریت کیشی و بلند پروازی کے عناصر ترکیبی کو پورے کمٹمنٹ کے ساتھ اختیار کیا۔اسرار خودی، زبور عجم اور ضرب کلیم میں ان کے یہ خیالات تفصیل سے تخلیقی انداز میں پیش ہو چکے ہیں۔اقبال کے خیال میں اسی وجہ سے علم وفن کو حیات کا خادم اور خانہ زاد ہونا چاہئے۔

؎ اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

؎ وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

؎ بلند بانگ چنانم کہ بر سپہر بریں ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

یہی بلند نگہی و بلند پروازی اور یہی عمودی و عروجی اور رجائی طرز تفکر اسلامی یا تعمیر ادب کا مایہ خمیر ہے۔

؎ دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است

'دلبری با قاہری' کے اسی مرکزی تصور تعمیری ادب کو بعد کے شعرا اور ادیبوں کے قافلے نے آگے بڑھایا ان میں قابل ذکر حفیظ جالندھری، ماہر القادری، نعیم صدیقی، عبدالعزیز خالد، جلیل عالی، حفیظ الرحمن احسن، تحسین فراقی، محمد اسحاق مائل خیر آبادی، حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد، قمر رسول پوری، قمر سنبھلی، عزیز بگھروی، ڈاکٹر تابش مہدی، افتخار راغب اور مسعود جاوید ہاشمی وغیرہ کے علاوہ نظم ونثر کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کرنے والے کثیر تعداد میں فن کار ملک اور بیرون ملک کے تقریباً ہر اردو خطے میں پائے جاتے ہیں۔

<u>اردو کی آفاقیت:</u> اردو کی اسی آفاقیت اور اخلاص مندی نے سارک ممالک (پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، جزائر، مالدیپ اور لنکا) کے علاوہ خلیجی ممالک (دوبئی، کویت، قطر، بحرین، شارجہ وغیرہ) میں اردو کے عام فہم الفاظ کو کاروباری لین دین اور تبادلہ خیال کا موثر

ذریعہ بنا دیا ہے۔اس ضمن میں اسکا رسم الخط بھی عربی، فارسی سے مماثلت کے سبب جذب کشش رکھتا ہے۔چنانچہ ہندوپاک کے لاکھوں لاکھ افراد ان ممالک میں کاروبار اور ملازمتوں میں اردو کی سہولت سے مستفیض ہو رہے ہیں۔یہ محض آج کی بات نہیں ۱۸۶۹ء میں سرسید لندن تشریف لے جا رہے تھے تو عدن کی بندرگاہ پر اردو کو ذریعہ اظہار دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔اپنے سفرنامہ میں موصوف نے اردو کی اس وسعت اور لسانی طاقت کا تذکرہ کیا ہے۔

ہندوستان کے اردو مخالفین کے لیے یہ تازیانۂ عبرت سے کم نہیں کہ ملک کے بعض علاقوں میں تو اس کے لیے زمین تنگ کی جا رہی ہے مگر جدید ٹکنالوجی اور سفر کی نت نئی سہولتوں کے سبب سمٹتے فاصلوں نے انگلستان، کینیڈا، سڈنی اور امریکہ جیسے دور دراز علاقوں میں بھی اردو کی نئی بستیاں بسانا شروع کر دیا ہے۔

ادب اور تحریک اسلامی

اس موضوع کے دو حصے کیے جاسکتے ہیں اولاً نظری دوم عملی۔

تحریک یا تحریکیت لفظ حرکت سے مشتق ہے، جس کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ ایک خاص مدت اور ایک خاص مسافت میں کسی قوت یا کسی مادہ یا فکر پر اثر کرنا حرکت ہے۔ حرکت مادی کے علاوہ غیر مادی یا عقلی بھی ہوتی ہے، حرکت عقلی نتیجہ ہے مراکز دماغی اور مجموعی عصبی حرکت کا۔ حرکت کی تمام قسمیں، (اجتماعی، انفرادی، حیاتی، جمالی اور فکری) مختلف محرکات کا نتیجہ ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قوت ایک قسم کی حرکت ہے جو مختلف حرکی تسلسل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حرکات سببی کے سلسلے کو چاہے جتنا پیچھے ہٹایا جائے اسکا سلسلہ ہرگز ختم نہ ہوگا بلکہ پیچھے ہٹتے ہٹتے ہم ایک مسبب الاسباب یا تمام قوتوں کو حرکت دینے والی ایک ایسی قوت کے تصور پر آکر رک جاتے ہیں جہاں منطقی طور پر مسبب بغیر سبب کے بھی ہوسکتا ہے۔ مختلف مذاہب میں اسی مسبب الاسباب کو خدا، بھگوان یا گاڈ کے مختلف ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی تمام حرکات کا منبع اسی ذات واحد کو تسلیم کیا ہے۔

؎ چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

رومی اور اقبال کی طرح برگساں بھی حقیقت اولی کو حرکی اور تخلیقی یا اسی کے لفظوں میں Elan vital یا جوش حیات تصور کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا، حسن اور قوت و توانائی کا مرکز اعلیٰ ہے، انسان بھی ایک ایغو (Ego) یا مرکز حیات کا حامل ہے اسکی منزل مقصود تسخیر کائنات کے ذریعہ رضائے الٰہی اور حیات ابدی کا حصول ہے۔ اردو کی تحریک انگریزی میں موومنٹ (Movement) بالخصوص صنعتی انقلاب کے بعد تبدار معنی کی حامل ہوگئی۔

جس کے مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے یعنی:۔

(۱)نصب العین (۲)اجتماعیت (۳)سعی وجہد (۴)اور طریق کار یا حرکات کا تسلسل جن سے دنیا میں بڑے بڑے انقلابات برپا ہوئے ہیں کیونکہ حرکات کے تسلسل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "It aims to introduce radical changes" تبدیلی اور انقلاب خواہ ذہنی ہو یا سماجی، مذہبی ہو یا سیاسی، نیز چھوٹی ہو یا بڑی، مقامی ہو یا عالمی بعض زمانی ومکانی احوال اور ذہنی وفکری اٹھان کسی قائد کی قیادت میں منصوبہ بند انداز سے اپنے مخصوص اغراض ومقاصد کو ایک تحریک کی شکل دیکر آگے بڑھانے کا عمل ہے مثلاً لیبر موومنٹ، کسان تحریک، وہابی تحریک، خالصتان تحریک اور تحریک نسواں وغیرہ۔

ادب وشاعری زبان کا آرٹ ہے اور زبان کو ایک عملی تخلیق تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے ہر مکتبہ فکر کے لوگ ادب وفن کو ایک ارتقائی عمل (Sublime) سے تعبیر کرتے ہیں اسی لیے علامہ شبلی نے ''فن'' کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> ''فن اس لیے اختراع کیا جاتا ہے کہ کسی مخصوص غایت کو پورا کرنے کا اس سے زیادہ موثر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا''

شاید اسی لیے پال ویلری بھی ''تخلیق شعر کے اندر ایک قوت عاملہ ایک زندہ وتابندہ نظام شکل پذیر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے'' بعض ناقدین اسے تشدیدی وتجیدی عمل سے بھی تعبیر کرتے ہیں یہ اسی وقت ممکن ہے جب فنکار کائنات کی مختلف چیزوں، حادثوں، ہیجانات معروضات اور ان کے خصائص کو اپنے قلب وذہن، جذبات وخواہشات اور تصورات کو اپنے حس وآگہی کا جزو لاینفک بنالے اور ان میں جمالیاتی وتخلیقی کشش پیدا کرنے کے لیے وحدت، تناسب، موزونیت اور معنویت کے ذریعہ قاری کے دل میں تموج وتحرک پیدا کردے۔ اسی لیے فن اور شاعری بنیادی طور پر نصب العینی، غایتی اور مقصدی

ہوتی ہے۔

فنکار کے اردگرد ہر لمحہ تغیر و تبدل مد و جزر اور کشمکش و کشاکش کی کوئی نہ کوئی صورت ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہے جس سے اسکا متاثر ہونا فطری ہے، اس تضاد اور کشمکش کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، کبھی اسے کلاسکیت و رومانیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تو کبھی مادیت و روحانیت، کبھی ٹوٹیم اور ٹیبو، کبھی قبض و بسط، خیر اور شر، کبھی فرد اور سوسائٹی تو کبھی قدیم و جدید کی ثنویت سے۔ غالب کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ منظور حسین نے اس صورت حال کو بڑے معنیٰ خیز انداز میں پیش کیا ہے۔

''جس جدلیاتی تاریخی عمل سے غالب کا عہد گزر رہا تھا، غالب اس کے ہر پہلو کو اپنی تہذیب اور شعری حسیات کے اندر جو ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے برابر سمیٹتے رہے'' (نقد و نظر، علی گڑھ شمارہ ۲ ۱۹۸۰ء)

غالب ہی کا ایک پر معنیٰ شعر ہے۔

؎ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

اقبال نے اسی حقیقت کو قدیم و جدید کے تناظر میں اسطرح پیش ہے:

؎ زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

بعض سیاسی و سماجی حالات و ضروریات کے پیش نظر اگر کسی مخصوص ملک، معاشرہ یا گروہ میں کوئی مخصوص رجحان تحریک بن کے ابھر جائے اور اس سے زندگی اور ادب متاثر ہونے لگے تو اس نوعیت کی تحریک کو خارجی یا تاریخی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً وہابی تحریک، آریہ سماجی تحریک، خلافت تحریک، برہمو سماج، رام کرشنا مشن، کانگریس یا مسلم لیگ وغیرہ جیسی تحریکات، اسی طرح داخلی و نفسیاتی تحریکیں بعض اوقات مختلف قسم کی سماجی بندشوں سیاسی رکاوٹوں وغیرہ سے جب گھٹن اور سٹراند کی کیفیت پیدا ہو جائے یا بعض داخلی

خرابیوں اور پستیوں سے اکتا کر بلندیوں کی طرف منفی یا مثبت عوامل کے تحت مائل بہ ارتقا کیا جائے یا بسا اوقات محرومیاں اور مایوسیاں جب کچھ دیر کے لیے ہنرمندیوں اور کامرانیوں میں تبدیل ہونے کے لیے انگڑائیاں لینے لگیں تو داخلی نوعیت کی تحریک اور رجحان کو پنپنے کا موقع ملتا ہے۔ بقول فراق:

؎ نہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش ایک نہ ایک خلد طرب ناک کا ارماں ہے ضرور

؎ ساغر فنا پی کر جی اٹھی ہے یہ دنیا موت کے بھی شیشوں سے زندگی ابلتی ہے

سیاسی و مذہبی اور سماجی تحریکات سے متاثر ادب و شاعری میں عام طور سے کوئی وسیع اور ہمہ گیر فلسفۂ حیات تہہ نشیں انداز میں کام کرتا رہتا ہے۔ اس طرح کی تخلیقات میں بالعموم کسی بڑے نصب العین کے لیے سب کچھ تج دینے کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔

؎ پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے (محمد علی جوہرؔ)

؎ توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے۔ (ایضاً) یا

؎ کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے (حسن نعیم)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا تحریک اور تغیر و تبدل ایک کائناتی اور آفاقی حقیقت ہے۔ یہ انسانی سرشت میں داخل ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش انسانی تاریخ اور اس کے ارتقا کی بنیاد ہے۔ یہ تلاش انفرادی سطح پر بھی ہوتی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی، اسکی نوعیت مادی، روحانی اور نفسیاتی بھی ہو سکتی ہے ادب و شاعری میں اخلاق مندی اور حب الوطنی کے

جذبات نے تقریباً ہر دور میں ہر طرح کے ادب کو متحرک رکھا ہے۔ اردو میں اسلام دوستی، خدا پرستی، عشق الٰہی اور اخلاقی اقدار نے تصوف، اصلاح پسندی اور انسانیت دوستی کے حوالے سے ہر دور میں اردو ادب کو متحرک اور مائل بہ ارتقا رکھا ہے۔ اسی طرح ملک پر یورپی و انگریزی غلبہ و استحصال کے خلاف ڈھائی سو سال سے نت نئی سیاسی و سماجی اور ادبی تحریکیں کام کرتی رہیں۔ تخلیق کار اور مصلحین وقت سماج کو متحرک رکھنے کے لیے عموماً تین طریقے اختیار کرتے ہیں اولاً وہ اپنے ماحول کے حقائق کو آئینہ بناتے ہیں، دوم طریق اظہار میں یقین و تسکین اور تاثر آفرینی کی کوشش کرتے ہیں، سوم اپنے طریق استدلال اور راہ نجات کو بڑی قوت و شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہر تحریک کی سرشت میں یہ تینوں خصوصیتیں کم و بیش ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہیں۔ ان کے بغیر وہ تحریک عوام کے قلب و دماغ میں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔ پچھلی صدی کی چوتھی دہائی میں تحریک اسلامی کے آغاز و ارتقا کے ساتھ اسلامی ادب نے تعمیری و فلاحی ادب کے نام سے ایک طاقتور ادبی تحریک شروع کی۔ بانی تحریک نے ایک موقع پر معیاری و موثر ادب کی سات خصوصیات کی طرف اشارہ کیا یعنی ایسے ادب میں (۱) ابتذال نہ ہو (۲) زبان عام فہم ہو (۳) وسعت معلومات کے ساتھ (۴) پختگی فکر بھی ہو۔ مزید یہ کہ اسمیں (۵) خلوص کے ساتھ (۷) فکر و عمل میں ہم آہنگی ہو۔

بہر حال ۱۸۵۷ء کے احساس شکست اور ہمہ گیر زوال کے معاً بعد خود احتسابی، پھر خود آگہی اور رومانیت و خود اعتمادی کے نتیجے میں تہذیبی و سیاسی سطحوں پر تجدید و احیائی رو تیز تر ہو گئی اور بیسیوں مختلف النوع تحریکات کی ایک آندھی سی چل پڑی۔ ۱۹۴۷ء تک بہت سی تحریکیں فراموش ہو گئیں اور کچھ کے دھندلے نقوش رہ گئے۔ اس دوران انگریز جیسی دانشور اور شاطر قوم سے ہندوستانیوں کا پالا پڑا اس لیے بتدریج یہاں کی سیدھی سادی اور سپاٹ قسم کی زندگی اور ادب پیچیدہ و تہدار ہوتے چلے گئے، اس سفر ارتقا میں مختلف شعرا و ادبا نے مختلف لب و لہجہ اختیار کیا جیسے حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، محمد علی جوہرؔ، ظفر علی خاںؔ، حسرتؔ، مخدوم

محی الدین، جوش، فیض، ماہر القادری وغیرہ۔اس پورے دور میں نصب العینی اور تحریکی شاعری کا شباب رہا مگر روایت سے غایت درجے کی محبت بھی ہر فنکار کے یہاں پائی جاتی رہی، یہاں تک کہ رومانی اور اشتراکی یا ترقی پسند تحریک سے متاثر در آمد شدہ افکار کے باوجود اردو شعرا نے اپنا ناطہ روایت سے برقرار رکھا۔روایتی فارموں اور صنفوں ہی کو اختیار کیا گیا، البتہ جزوی ترمیم اور حذف واضافے ضرور کیے گئے۔موضوع کی سطح پر غالب، حسین آزاد، حالی وشبلی اور اقبال نے جو ڈگر قائم کر دی تھی وہ برقرار رہی روایت سے محبت کے علاوہ تعمق فکر اور تسلسل خیال نے غزل کو غزل مسلسل بنا دیا۔مختلف قسم کے ازموں، تحریکوں، رجحانات اور مربوط افکار نے اپنے اپنے دائرۂ اثر کو بڑھانے کے لیے اپنے فکر وفن میں وسعت اور ہمہ گیری اختیار کی۔

اس پورے دور میں علامہ اقبال کی فکری وفنی عظمت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے دیگر شعرا کے مقابلے میں کائنات کے حرکی تصور اور اسلام کی تسخیر وتازگی، برق تابی وشعلہ نوائی، بلند نگہی وسخت کوشی، روشن بینی وجہاں بانی، جرأت کیشی وبلند پروازی کے عناصر ترکیبی کو پورے کمٹمنٹ کے ساتھ اختیار کیا۔اسرار خودی، زبور عجم اور ضرب کلیم میں ان کے یہ خیالات تفصیل سے آچکے ہیں۔ان کے خیال میں علم وفن کو حیات کا خادم اور خانہ زاد ہونا چاہیے۔

؎ سرود وشعر وسیاست، کتاب ودین وہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

؎ اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کرسکیں تو سراپا فسون وافسانہ

؎ وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے — یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

؎ بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں — ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ یہی بلند نگہی وبلند پروازی اور یہی عمودی وعروجی طرز تفکر

اسلامی یا تعمیری ادب کا مایۂ خمیر ہے۔ شاعری کے حسن و قبح کے بنیادی تصور کو اقبال نے حضور اکرمؐ کے دو موقعوں کے اقوال سے استنباط کیا ہے۔ اولاً امراء القیس کو ''اشعر الشعرا'' اور ''قائدھم الی النار'' کہنا اور دوسرے موقع پر عنترہ بن شداد عبسی کا یہ شعر:

وَلَقَدْ اَبِیتُ علی الطویٰ واَظَلُّہٗ حتّٰی اَنَالَ بہٖ کریم الماٰکل

سن کر خوشی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اس سے ملنا پسند کرتا۔ اپنی پسند و ناپسند کا حضورؐ نے جو اصول پیش کیا اقبال نے اپنے ایک مقالہ میں با ایں الفاظ (ملاحظہ ہو مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب کی ترویج میں اقبال کا کردار'' از ڈاکٹر تحسین فراقی مطبوعہ ماہنامہ سیارہ لاہور اشاعت خاص: ۵۷ ۲۰۱۰ء) اس کی وضاحت کر دی ہے

".............That art is subordinate to life not : superior to it.............There should be no opium eating in art"

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا۔

اور

شاعر دلنواز بھی بات اگر کہے کھری ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است

''دلبری با قاہری'' کے اسی مرکزی تصور تعمیری ادب کو بعد کے شعرا اور ادیبوں کے قافلے نے آگے بڑھایا۔ ان میں قابل ذکر ماہر القادری، نعیم صدیقی، عبدالعزیز خالد، جلیل عالی، محمد اسحاق مائل خیر آبادی، حفیظ میرٹھی، ابو المجاہد زاہد، حفیظ احسن وغیرہم کے علاوہ نظم و نثر کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کرنے والے کثیر تعداد میں فنکار ملک اور بیرون

ملک کے تقریباً ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔

اس ایک صدی کے دوران حلقۂ ارباب ذوق ہوں یا رومانی تحریک کے نام لیوا، ترقی پسندی کی اشتراکیت و مادیت کے علمبردار ہوں یا جدیدیت کی اساطیری خرافات کی بھول بھولیاں، ہر دور میں اسلامی و تعمیری ادب کے جیالے زندگی کے متقی اور خالص مادی یا حیوانی نقطۂ نظر کے برخلاف حیات و کائنات کے مثبت اور اخلاق مندانہ تصورات کے زیر اثر آگہی، بصیرت، لازمانیت، ایمان اور عشق سے لبریز تخلیقات پیش کرتے رہے۔

''ادب اور تحریک'' کے عملی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو ان دنوں ملکی، عالمی، ادبی اور ثقافتی اعتبار سے بظاہر حالات نامساعد اور بے حد ناسازگار معلوم ہو رہے ہیں۔ مگر گہرائی سے تجزیہ اور مثبت پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے تو عسر کے ساتھ یسر اور یسر کے ساتھ عسر کی دھوپ چھاؤں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جہاں ایک طرف مادیت، صارفیت، جنسیت اور بربریت کی یلغار بڑھی ہے وہیں وسائلِ مال و ابلاغ کی بہتات، اخلاقی و روحانی اقدار کی بازیافت اور نقد و احتساب کی چاہت میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں ادبی خورد و فروشوں اور خود فراموشوں کی کمی نہیں، اس ماحول میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کا دائرہ تو بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے مگر اردو لکھنے والوں کا دائرہ سکڑتا اور سمٹتا جا رہا ہے۔ شمالی ہند کے اہل زبان کی نئی نسل بے زبان ہوتی جا رہی ہے مگر مغربی اور جنوبی ہند کے حقیقت پسند شائقینِ اردو، فروغ زبان و ادب میں غیر معمولی کاوشیں کر رہے ہیں۔ اردو نے ہمیشہ عوامی سطح سے جڑ کے جذباتی، ثقافتی اور روحانی اعتبار سے تسکین کامل کا سامان فراہم کیا ہے جو کسی دوسری زبان میں تقریباً مفقود ہے اس لیے عالم کاری کے دور حاضر میں ملک کے باہر بھی اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ لہٰذا بدلے ہوئے موجودہ لسانی و ادبی منظر نامے کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے تخلیق کار اگر واقعی کچھ ٹھوس ادبی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں سہ طرفہ سعی و جہد کا آغاز کرنا پڑے گا۔ یعنی وقت واحد میں ہر ادیب اور شاعر کو

اردو کا مبلغ، معلم اور مجاہد کا رول ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ زبان کے تحفظ و بقا کے بغیر ادب اور تخلیق کے مسائل مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

ادب کا دوسرا تحریکی تقاضہ یہ ہے کہ ہم ''ادارۂ ادب اسلامی'' کو ''ادارہ ادب اردو'' تک محدود نہ کردیں بلکہ ملک کے طول و عرض میں علاقائی زبانوں کے اخلاق مندانہ اقدار کے حامل فنکاروں کو بھی بیدار اور متحرک کریں۔ ایسے جملہ فنکاروں کی تین زمروں میں فہرست سازی کی جاسکتی ہے: (۱) معاون فنکار (۲) غیر جانبدار اور (۳) معاند، اور پھر اسی اعتبار سے ان سے رشتہ استوار کیا جائے۔ ہر اہم ادبی حلقے کے سالانہ جلسوں میں ایک اہم شاعر اور ایک اہم نثر نگار کو خصوصی اعزاز و اکرام سے نوازہ جائے۔ اپنی ادبی نشستوں کی رودادیں مرتب کی جاتی رہیں۔ ان نشستوں میں پیش کردہ تخلیقات پر ہمدردانہ نقد و تبصرہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے۔ اور اپنے ادبی ترجمان کے شائقین کی تعداد میں اضافہ اور نشر و اشاعت میں اجارہ داری کے بجائے اسکی معیار بندی کی جائے۔ جو تجویزیں منظور کی جائیں ان کی ڈنڈی ماری کے بجائے ان پر ایمان داری سے عمل آوری کی جائے تو یقین جانیے کہ اس تعمیری ادبی تحریک کی تیز رفتار ہمہ جہت ترقی کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

؎ جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

(اقبال)

اردو شاعری میں محنت کش عوام

تقریب فہم کیلئے اردو شاعری کی پوری تاریخ کو اگر کلاسیکی اور جدید کے دو ادوار میں تقسیم کر کے دیکھیں تو بحیثیت مجموعی ان میں محنت کش عوام کی نمائندگی کی بھی دو نوعیتیں رہی ہیں اولاً مذہب کے زیر اثر اخلاقی اور مثالی عوام دوم فکر و فلسفہ اور نفسیات کے زیر اثر تمدنی و معاشی عوام۔ چنانچہ پوری اردو شاعری میں محنت کش عوام کو انہیں دو نظریاتی پہلوؤں کے زیر اثر تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مذہب کے زیر اثر ایک طرف تو تصوف و بھگتی کے رجحانات نے احترام آدمی کے نقطہ نظر کو اجاگر کیا اور مزدور کی مزدوری کو اسکا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادائیگی پر زور دیا گیا اور اسے کارگاہ عالم کا محرک و محسن مانا گیا مگر تاریخ کے مختلف ادوار میں مذہب اور دھرم کا جب جب سامراجی و سامنتی نظاموں نے استحصال کیا تو اس کے جوے تلے غریبوں اور محنت کش طبقوں کو سب سے زیادہ پامال ہونا پڑا اس تلخ حقیقت کو اقبال نے اپنی مشہور نظم "دلینن خدا کے حضور میں" نہایت موثر تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے:

؎ وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
مشرق کہ خداوند سفیدان فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات؟

اور آگے چل کر دریافت کیا ہے کہ بندۂ مزدور کے اوقات انتہائی تلخ ہو چکے ہیں آخر اس سرمایہ پرستی کا سفینہ کب ڈوبے گا۔

بہر حال بادشاہت اور جاگیرداری نے جہاں بہت سی انسانی قدروں کو پامال کیا وہیں اس نے مزدوروں اور محنت کشوں کا بھی بری طرح استحصال کیا۔ شاعری جسے تنقید حیات کہتے ہیں وہ حکمراں طبقہ کے عیش و عشرت اور دل بہلاوے کا ذریعہ بن گئی تو کلاسیکی

داستانوں کی طرح کلاسیکی شاعری میں بھی ان کی حیثیت ذریعۂ عیش بن گئی اوران کا کردار سایوں میں تبدیل ہوکر رہ گیا۔اردو کی چھوٹی بڑی کلاسیکی مثنویوں میں شہر آشوب، گھر کا حال اور دنیائے دنی کے احوال پیش کرتے وقت ہمارے اہم شاعروں کے یہاں بھی محنت کش عوام کی بھرپور اور مثبت عکاسی بالعموم نہیں ملتی۔ خواصوں، خواجہ سراؤں، خوجوں،نقیبوں، نقارچیوں،شہنا نوازوں، بھانڈوں، بھگتیوں، سازندوں ،گائکوں،تھکاروں وغیرہ کی فنی مہارت،ان کے خلوص،وفاشعاری اورمحنت شاقہ کی جابجا مبہم تصویریں برسبیل تذکرہ تو مل جاتی ہیں مگران کی اخلاقی اور مثالی حیثیت معدوم ہوجاتی ہے۔مثنوی سحرالبیان کا ایک منظر ملاحظہ ہو

جہاں تک کہ سازندے تھے ساز کے　　دھنی دست کے اور آواز کے
جہاں تک کہ تھے گائک اور تنت کار　　لگے گانے اور ناچنے ایک بار
لگے بجنے قانون و بین و رباب　　بہار ہر طرف جوئے عشرت کا آب

کلاسیکی شاعری کے عہد میں نظیر اکبرآبادی کا امتیاز اور اسکی انفرادیت اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں شرفا کی بدحالی اور ارباب اقتدار وعلم وفن کی کسمپرسی پر آنسو بہانے کے بجائے اپنی مختلف نظموں میں دست کاروں اور پیشہ وروں کی تباہ حالی کا ماتم کیا ہے۔اور دورِ زوال میں متوسط اور محنت کش طبقے کی بدحالی و مفلسی کی دردناک تصویریں کھینچ دی ہیں۔اپنی مشہور نظم شہر آشوب میں نظیر اکبرآبادی نے آگرے کے بے روزگاری کا ماتم کیا ہے اور دکھایا ہے کہ بے روزگاری نے عوام کو مفلس وقلاش بنادیا تھا:

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے، یہ چھائی ہے مفلسی

دیواروں کے بیچ آ کے سمائی ہے مفلسی ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہیں جوں ایک بار بند

چنانچہ اس سیلاب بلا میں جوہری، صراف، سیٹھ، ساہوکار، سوداگر، بیوپاری، بزاز، پنساری، بساطی، مانبائی، مصور، مینا ساز، نقاش، دانا، نادان، عالم، جاہل، کاریگر، اناڑی، شریف اور رذیل سب کی کشتی جہالت و مفلسی کے بھنور میں ڈوبنے کو تھی۔

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دست کار
اور جتنے پیشہ دار ہیں، روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے من لوہار، تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

آخر اس زوال وانحطاط کے نتیجے میں اپنی محنت اور علم وسائنس اور تجارت کے بہانے جب سات سمندر پار کی انگریز قوم نے ہندوستان کو اپنا غلام بنالیا تو ہمارے فنکاروں اور شعرا نے بچشم خود یہ دیکھا کہ محض محنت شاقہ کی بنیاد پر اجنبی قوم کے مٹھی بھر لوگوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا پر قبضہ کرلیا۔ غریبوں اور محنت کش عوام کی تذلیل کرنے والے تمدن نے ۱۸۵۷ء میں اس غلامی سے نکلنے کے لیے ہزار ہاتھ پاؤں مارے مگر اسکا حاصل ناکامی ونامرادی کے سوا کچھ نہ ہوسکا بلکہ مزید ایک صدی کے لیے غلامی کی زنجیریں مستحکم ہوگئیں۔ اس دردناک صورت حال نے ہمارے شعرا وادبا کو بے چین کردیا چنانچہ سرسید و حالی نے جب عمومی بیداری کی تحریک کا آغاز کیا تو محنت اور مزدوری کرنے والوں کی ضرورت واہمیت کو بھی اجاگر کیا۔ پرانا نظام تمدن اپنی کاہلی، کام چوری، عیش وعشرت اور ذہنی خام خیالیوں کے ساتھ دفن ہوگئی تو انہوں نے نظم ونثر، انجمنوں اور مختلف تنظیموں کے ذریعہ عوامی زندگی کو باشعور، بیدار، منظم اور باخبر کرنے کی مسلسل جد وجہد کا آغاز کردیا۔ مغربی علم

وفن اور سیاست وتمدن نے بتدریج ہندوستانی زندگی کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا تو مولانا حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے ایک نئے طرز کے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ:۔

''ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی ہے اسکو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اسکی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے''۔

اس حقیقت نگاری اور وسعت پذیر ادبی منظر نامے کو سرسید، الطاف حسین حالی، شاد، عبدالغفور شہباز اور نواب امداد امام اثر وغیرہم نے نئی زندگی بخشی۔ چنانچہ عمومی بیداری کی ایک لہر چل پڑی تہذیب الاخلاق، مسدس حالی اور دیگر اجتماعی کاوشوں نے عوام کی اہمیت، محنت کی برکت اور علم کی عظمت کا ایک نیا شعور بخشا۔

رومانی تحریک کے معماروں میں محمد حسین آزاد کے بعد سید ناصر علی (رسائل ''صدائے عام'' اور ''تیرھویں صدی'') عبدالحلیم شرر، مخزن اور مولانا آزاد کی تحریک نے اپنے اپنے دائروں میں فرد کی آزادی اسکی اہمیت اور عوامی بیداری کے کاز کو تقویت پہنچائی۔ شاعر مشرق اقبال کی رومانیت کا اولین زاویہ حسن ازل کی طلب وجستجو میں ظاہر ہوا۔ ان کا دوسرا زاویہ ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کرتا ہے اور تیسرا زاویہ بقول ڈاکٹر انور سدید ،رومانی کرداروں کی تخلیق کرتا ہے۔ اقبال کا مرد مومن صاحب خودی بن کر یقین محکم اور عمل پیہم کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ یوں اقبال کی رومانیت نے فرد کے متزلزل یقین کو سنبھالا دیا اور اسمیں زندہ رہنے کی سکت پیدا کی۔ اردو شاعری میں رومانی تحریک کی ایک عطایہ بھی ہے کہ اس نے غزل کے غلبہ وتسلط کو کم کر کے اشیا اور ماحول کے دھندلے پن کو نظم نگاری کے ذریعہ منور کر دیا۔ کیونکہ اردو نظم کو ایک سطح پر فرد کے نمایاں ہونے کی خواہش سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری نے بالخصوص عوام اور محنت کش طبقات کو ایک نئی زندگی اور تابندگی بخشی۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فکر اقبال نے حیات و کائنات کا جو انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا اسکی ایک بنیادی حقیقت خود ان کے لفظوں میں اس طرح ہے:۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

''سرمایہ و محنت'' کے زیر عنوان انہوں نے سارے عالم کے ہر طبقے کے مزدوروں کو جو حیات بخش پیغام دیا ہے اسکی فکری و فنی آب و تاب میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ ان کے خیال میں سرمایہ داروں نے خون مزدور کو چوسنے کے لیے ہزار مکر اور حیلے تراش لیے ہیں۔ ان میں ''نسل، قومیت، سلطنت، تہذیب، رنگ'' جیسے بتوں اور خیالی دیوتاؤں کا فریب دے کر انہیں ہمیشہ لوٹا اور تباہ و برباد کیا ہے۔

مگر بزم جہاں کا اب تیزی سے رنگ بدل رہا ہے اس لیے وہ مزدوروں کو للکارتا ہے کہ

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور مخلصانہ مشورہ دیتا ہے کہ

کر مکن داں طواف شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کے چمن زار میں آباد ہو

وہ اپنے پڑوسی ''پنجاب کے دہقان سے'' بھی سوال کرتا ہے کہ آخر ہزاروں برس تک اس خاکبازی کا کیا حاصل ہوا۔ سحر کی اذاں ہو چکی ہے، جاگ اور اپنی خودی کو پرکھ کے جہان تازہ پیدا کر اقبال کا شاعرانہ اخلاص اس وقت اور واضح ہو جاتا ہے جب وہ مزدوروں اور دہقانوں کو جو پیغام دیتا ہے اسی پیغام کو با انداز دیگر اپنے بیٹے ''جاوید سے'' بھی برملا دہراتا ہے:

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ
دہقان اگر نہ ہو تن آساں ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ

انہیں باتوں کو اقبال نے "فرشتوں کا گیت" اور "فرمان خدا" نیز "لینن خدا کے حضور" وغیرہ میں ایک نئے انقلاب انگیز اور نصب العینی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں جوہر عشق و خودی کے بغیر غریب عوام اور محنت کش افراد کے لیے "دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام" ہیں لہذا اسلطانی جمہور کا زمانہ آرہا ہے اس لیے

؎ جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

مگر مغرب کی "عوام دوستی اور مزدور نوازی" کے اشتراکی و سرمایہ پرستانہ پروپیگنڈوں کا یہ کہہ کر پول کھول دیا ہے کہ

؎ یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے علامہ اقبال سے کسب فیض کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا پھر بھی مارکسی فکر کے غلبہ اور اس کے یکرخا پن کی وجہ سے اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر محنت کش عوام کی بھرپور اور ہمہ جہت نمائندگی تو ہوئی مگر اس ضمن میں فکر و فن کا جو معیار اقبال نے پیش کیا تھا اس معیار کو ہمارے ترقی پسند شعرا برقرار نہ رکھ سکے۔ علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز اور فیض احمد فیض وغیرہ کے شعری کارناموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ممبئی میں ترقی پسند تحریک کی چوتھی کل ہند کانفرنس کے اعلان نامے میں آزادی، مساوات، انسان دوستی اور ترقی پسندی کے عقیدے میں یقین کامل پیدا کرنے کے دعوؤں کے باوجود اس عہد میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو شاعری تخلیق ہوئی اس میں نعرہ بازی کا عنصر زیادہ تھا۔

؎ کسان سیلاب بن کے ابھرے — پلٹ گئیں وقت کی ہوائیں
الٹ گئیں سلطنت کی چالیں

مغل شہنشاہیت کو مہاراشٹر کے شیروں نے نوچ ڈالا (علی سردار جعفری)

؎ گر رہا ہے سپاہی کا ڈیرا ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے کھل گیا انقلابی پھریرا

(مخدوم محی الدین)

؎ بڑھ کے اس اندرسبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، ان کا شبستان پھونک دوں
تخت سلطان کیا، میں سارا قصر سلطان پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

(اسرار الحق مجاز)

؎ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے بول زباں اب تک تیری ہے
بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

(فیض احمد فیض)

ترقی پسند تحریک کی اس فکری و فنی ٹریجڈی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سجاد ظہیر علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالعلیم کے کٹر پسندانہ سیاسی نظریات اور احمد علی اور اختر حسین رائے پوری کے نسبتاً نرم نظریے اور ادبی برتری کے درمیان جو ٹکراؤ ہوا ان کے درمیان ملک راج آنند کی مصالحانہ کوشش کے باوجود کوئی نقطۂ اتصال تلاش نہ کیا جا سکا اور اول الذکر نقطۂ نظر ثانی الذکر پر بھاری پڑ گیا۔

ان میں فیض احمد فیض نسبتاً نرم لب و لہجے اور لطیف علامتوں کے شاعر سمجھے جاتے رہے ہیں، ان کا شاعرانہ مرتبہ بھی مسلم ہے مگر محنت کش اور غریب عوام کی شاعرانہ تصویر کشی بالعموم ان کا تخلیقی رویہ جذباتی اور سطحی ہو جاتا ہے۔ آج کے نام اور آج کے غم کے نام میں انہوں نے کلرکوں، کرم خوردہ دلوں، پوسٹ مینوں، تانگے والوں، ریل بانوں، کارخانوں

کے بھوکے جیالوں اور دہقانوں وغیرہ کی گردان جس طرح پیش کی ہے وہ مضحکہ خیز ہے۔ اسی طرح "ترانہ سر مقتل، سیاسی لیڈر کے نام، افریقہ کم بیک (Africa Come Back)، شورش، زنجیر، بسم اللہ وغیرہ کمزور قسم کی سیاسی نظمیں ہیں جن میں غیر شاعرانہ انداز سے محنت کش عوام کی طرف کچھ اشارے آگئے ہیں۔ لیکن جن نظموں میں وہ رومان سے انقلاب تک کے مراحل طے کرتے وقت اپنی رومان پروری کو ترجیح دیتے ہیں، وہاں انداز بہر حال غنیمت ہوتا ہے مثلاً "مرے ہمدم مرے دوست، اے دل بیتاب ٹھہر، نثار میں تیری گلیوں پہ، مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں اور خاص کر "کتے" کی ایمائیت قابل تحسین ہے۔ بعض اشعار اپنی محدود معنویت کے باوجود اب بھی پر کشش اور متاثر کن ہیں۔

یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا — کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پراسرار کھڑی دیواریں — جل بجھے جن میں ہزاروں جوانی کے چراغ
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے اے دوست — ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

ترقی پسندی کے ردعمل میں حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کا دور قابل ذکر ہے جن کے یہاں بلند بانگ لہجے کے بجائے لطیف اور لوچدار سرگوشی کو فروغ حاصل ہوا۔ انہوں نے خارجی جبر کے بجائے داخلی عرفان کے تحت تخلیق ادب کو ترجیح دی۔ اس لیے انہوں نے زندگی اور فن کے امتزاج سے کام لیا ان میں یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی، منیب الرحمن، مجید امجد، انجم رومانی وغیرہ کی شاعری میں جابجا ایمائی انداز میں محنت کش عوام کے نیل ونہار کو پیش کیا گیا ہے۔ آگے چل کر حلقہ ارباب ذوق کے ایک گروہ نے تو ترقی پسندی کی تحریک شروع کر دی تو عوامی رجحانات دوبارہ با انداز دیگر منظر عام پر آئے آگے چل کر

ناصر کاظمی، شہزاد احمد اور شہرت بخاری نے جدید غزل کو نئی لطافتوں سے ہمکنار کیا۔ ناصر نے میر کے دل گرفتہ انداز کی باز آفرینی کی۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

ماہر القادری، نعیم صدیقی، عامر عثمانی، فروغ احمد، نجم الاسلام، اسرار احمد سہاروی، ابن فرید، مائل خیر آبادی، حفیظ میرٹھی، عزیز بگھروی، سہیل احمد زیدی، حفیظ الرحمٰن احسن رؤف خیر، علقمہ شبلی، ظہیر صدیقی وغیرہم نے تحریک ادب اسلامی کے مقاصد کو فروغ دیا اور اپنے کلام میں اسلامی اقدار حیات کے زیر اثر حیات و کائنات کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ یوں کہنے کو تو اسلامی و اخلاقی بنیادوں پر تعمیری ادبی تحریک آزادی کے بعد برصغیر کی تحریک اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے زیر اثر شروع ہوئی مگر تاریخی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کی پیدائش اور آغاز ہی سے صوفیا اور اسلامی و اخلاقی اقدار نے اردو شاعری کو تعمیری جہت دی ہے۔ مگر آزادی کے بعد اشتراکیت اور ترقی پسند ادبی تحریک کی خدا بیزاری، جنسی بے راہ روی اور نظریاتی انتہا پسندی نے اس تعمیری تحریک کے فروغ و ارتقا کو مہمیز کیا اور اسلامی و اخلاقی اقدار کی روشنی میں تعمیر پسند شعرا نے ہر طرح کے استحصال کی نفی کی۔ ان کے خیال میں محنت کش عوام کو اگر ایک طرف سامراجی سیاست اور سرمایہ دارانہ معیشت نے تباہ کیا تو دوسری طرف اشتراکی نظام نے بھی اپنے انداز سے کچھ کم استحصال نہیں کیا۔ لہٰذا ان کی حقیقی صلاح و فلاح تو اسلامی و اخلاقی اقدار ہی میں مضمر ہے چنانچہ ان شعرا نے اپنے کلام کو محنت کشوں کی مصنوعی ہمدردی سے پاک رکھنے کی امکانی سعی کی۔ اس ضمن میں بالخصوص نعیم صدیقی، عبدالعزیز خالد، ماہر القادری، فضا ابن فیضی ڈاکٹر سہیل احمد زیدی، عزیز بگھروی اور رشید کوثر فاروقی کے کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ کیا ہم نے کیا؟ کیا تم نے کیا؟ کیا ہم کو ملا؟ کیا تم کو ملا؟
کہنے کو بہت سی باتیں ہیں، کہنے کا یارا بھی تو نہیں
چبھے قہقہے تھے غیروں کے
میں تو محفل میں جیسے تھا ہی نہیں (نعیم صدیقی)

؎ رائیگاں سب کچھ ہوا، کیسی بصیرت کیا ہنر
گر دگر دا پنی بصیرت، خاک خاک اپنا ہنر (فضا ابن فیضی)

؎ سلام ان پہ جنھوں نے مگر بسا ڈالے
مگر خود اپنے لیے جھونپڑا بنا نہ سکے
ساون ساون گھاؤ لگے ہیں جیٹھ جیٹھ پروائی چلی
کچھ غم حاضر کچھ غم ماضی جیون بھر کی کمائی ہے
موت جب آئی تب یاد آیا ہم بھی جیتے تھے ورنہ
عمر گزاری اور نہ جانا اپنی ہے کہ پرائی ہے (رشید کوثر فاروقی)

؎ ترا ظلم منفرد ہے مرا درد بھی یگانہ
نہ تری مثال کوئی نہ مرا جواب کوئی
کوئی اعتبار اس کا نہ کہیں وقار اس کا
کبھی آدمی پہ ایسا نہ ہوا عذاب کوئی (عزیز بگھروی)

ڈاکٹر سہیل احمد زیدی اور حفیظ میرٹھی کی نظم وغزل میں بھی اس طرح کے خوبصورت اشعار کی کمی نہیں مگر بحیثیت مجموعی حیات وکائنات کی مختلف جہتوں کو رچے ہوئے تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی بکثرت مثالیں تعمیر پسندوں کے یہاں بھی نہیں ملتیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد سے اردو شاعری پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اثرات نے محنت کش عوام کے مسائل کے تخلیقی اظہار کو تقریباً نظر انداز کر دیا۔ جس کی دو وجہیں ظاہر

ہیں۔اولاً یہ کہ ترقی پسند تحریک نے پرولتاری انقلاب کے نام پر کسان،مزدور،روزی،روٹی اور ہاتھ کے موضوعات پر شاعری سے زیادہ نعرہ بازی کو ہوا دی اور جدیدیت کی لہر پر چونکہ ترقی پسند تحریک کا ردعمل بھی واضح تھا اس لیے یہ اہم انسانی موضوع ان کے لیے تخلیقی محرک نہیں رہ گیا۔دوسری وجہ یہ تھی کہ ادب وتخلیق میں مقصدیت کی نفی کے رجحان اور جدید فنکار جب اپنی شکست کی آواز ہو کر رہ گئے تو وہ اپنی ذات کے خول میں محصور ہو گئے۔انہیں خارجی مسائل سے ربط برائے نام رہ گیا۔نتیجتاً محنت کش عوام کے احساسات وجذبات کی عکاسی انکے یہاں شاذونادر ہی ملتی ہے۔البتہ وجدانی وباطنی اثرات کے تحت عصری استحصالی ماحول کا مرثیہ پیش کرتے وقت بعض اشارے ان مسائل کی طرف لطیف انداز میں سامنے آتے رہے

؎ اپنی تعداد بھی کم ہے یعنی آج چوپال میں چپ رہنا ہے
ہم کروڑوں میں ہیں لیکن بیکار ہم کو ہر حال میں چپ رہنا ہے
(مظفر حنفی)

؎ ہے رات بھی پژمردہ، تھکا ہارا سا دن بھی
اب کس سے کہیں شام وسحر کس کے لیے ہے (ضیا علیگ)

بہر حال تاریخ کے مختلف نشیب وفراز کے ساتھ اردو شاعری میں محنت کش عوام کے کوائف تخلیقی انداز میں منظر عام پر آتے رہے ہیں۔اس لحاظ سے بھی اردو شاعری کا دامن مالامال ہے۔

باب دوم

شخصیات

پروفیسر عبدالمغنی۔۔۔۔کچھ یادیں، چند باتیں

نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہوا 1955ء میں پٹنہ کالج کے بی۔اے اردو آنرز کلاس میں خاکسار کا داخلہ ہوا۔اندنوں داخلہ ختم ہوتے ہی کالج کی مختلف طلباء تنظیموں بشمول بزم ادب پٹنہ کالج کے انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوجاتی تھی۔اس وقت تک سب سے زیادہ جوش وخروش بزم ادب کے الیکشن میں دیکھا جاتا تھا۔الیکشن کو ابھی چند روز باقی تھے ایک ساتھی نے کالج کاریڈرو سے گذرتے ہوئے ایک چھریرے بدن،صاف رنگ،اوسط قد،کھڑے ناک نقشے اور بڑی بڑی آنکھوں والے ایک نوجوان کو آواز دی جو کرتا پائجامہ اور ٹوپی میں ملبوس تھے۔رسمی سلام کلام اور تعارف کے بعد ٹوپی والے نوجوان نے بڑی گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔معلوم ہوا کہ بی اے انگریزی آنرز کے طالب علم اور بزم ادب کے عہدۂ سکریٹری کے امیدوار ہیں۔ہمارے ساتھی نے بتایا کہ یہ عبدالمغنی ہیں جو مدرسہ شمس الہدیٰ کے عالم اور اردو زبان وادب سے عشق کی حد تک تعلق رکھتے ہیں اور جو مدرسہ کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا ارتضا الدین حاذق ضیائی صاحب کی رہنمائی میں وہاں کے پرنسپل مولانا ریاست علی ندوی صاحب (عرف عام میں اسٹیٹ علی ندوی) کے خلاف قومی جھنڈے کے اکرام میں کھڑے ہوکر سلامی دینے کے خلاف ایک معرکہ سر کرکے آئے ہیں۔اس پہلی ملاقات کا کوئی خاص تاثر یاد نہیں رہا۔البتہ طلباء کے درمیان ان کی الیکشنی تقاریر اور بزم ادب پٹنہ کالج کی اہمیت وافادیت اور اپنے عزائم کو جس خود اعتمادی اور جوش وخروش سے پیش کیا اس سے ہماری قربت بڑھتی گئی۔بی اے لکچر ہال میں فی البدیہہ تقریری مقابلے میں ان کا جوہر کھل کے سامنے آیا۔عبدالمغنی صاحب کا نام پکارا گیا۔اسٹیج ہی پر انہیں ایک بند کاغذ کا ٹکڑا دیا گیا۔مسکراتے ہوئے اسے کھولا اور چند سکنڈ

کے توقف کے بعد بہار کی ''چند اہم تاریخی شخصیات'' کے عنوان پر روانی کے ساتھ بلند آواز سے بولنا شروع کر دیا۔

محترم حضرات وسامعین کرام! عہد قدیم سے آج تک یوں تو بہار میں ایک سے ایک اہم شخصیات کے کارنامے تاریخ میں انمٹ ہیں مگر محض 9 منٹ کے اندر اندر سب پر اظہار خیال کے بجائے میں محض چند شخصیات ہی پر کچھ اشارے کر سکوں گا کیونکہ مشہور محقق اور عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانی کے بقول:۔

''بھارت کے علمی وفکری اور تمدنی اور تہذیبی عروج کی ابتداء مگدھ دیش (بہار شریف

یا نالندہ، راجگیر، پاداپوری، حاجی پور، گیا وغیرہ) سے شروع ہوتی ہے۔''

اور شیخ عبدالحق محدث اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ رحمہ کے لفظوں میں ''بلدۂ بہار مجمع علما تھا''

مورخین گواہ ہیں کہ مولانا محی الدین فیضی بہاری عرف ملا موہن اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق تھے اور قاضی محب اللہ بہاری نے داراشکوہ کو تعلیم دی تھی۔

پھر معمولی سے وقفہ کے بعد موصوف نے پانچ اہم ترین موضوعات کے ذیل میں تین، تین اہم ترین تاریخی شخصیات کا ذکر کیا۔

(۱) مذہبی رہنماؤں میں: مہاتما بودھ، مہاویر جین اور حضرت مخدوم شرف الدین بہاری، موثر الذکر کے بارے میں بتایا کہ اہل علم جانتے ہیں کہ ''پورے ہندوستان میں صحیحین کی تعلیم شروع کرنے والے، بہار کے شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری تھے۔

(۲) سیاسی شخصیات میں مہاراجہ اشوک، شیر شاہ سوری اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے نام گنائے

۔

(۳) اردو کے محققین میں نواب علی ابراہیم خان (مصنف گلزار ابراہیم) قاضی عبدالودود اور

پروفیسر حسن عسکری کے نام یاد دلائے۔

(۴) ناقدین کی فہرست میں نواب امداد امام اثر صاحب کاشف الحقائق، عبد الغفور شہباز اور اپنے موجودہ پرنسپل پٹنہ کالج جناب کلیم الدین احمد کے نام نامی کو پیش کیا۔

(۵) اردو شعرائے کرام میں: راسخ عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی اور استاذ گرامی علامہ جمیل مظہری کا تذکرہ کیا۔

اور اپنی پر جوش تقریر اس شعر پر ختم کر کے تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں اولین مقرر قرار پائے

؎ بارگاہ علم ہے تہذیب کا مسکن ہے یہ اولیا و اصفیا کا دلنشیں گلشن ہے یہ

بزم ادب کی سکریٹری شپ کی کامیابی کے بعد نصابی اور صحافتی و سماجی مصروفیات کی وجہ سے بعض طلبا کے کئی پروگراموں کو موصوف نے نظر انداز کر دیا ان کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی کو بعض ساتھیوں نے خودسرانہ انداز پر محمول کیا تو اگلے انتخاب کے موقع پر مجھ سے ایک سال سینئر کلیم عاجز صاحب کو ہم لوگوں نے بزم ادب کے سکریٹری کے لئے کھڑا کیا۔ اور عبد المغنی صاحب کے خلاف مہم چلائی چنانچہ وہ اگلے سال ہار گئے۔ پھر تو ایم اے کرتے کرتے علمی و ادبی کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی اور صحافتی و لسانی مسائل پر بھی بے تکاں اردو اور انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔

عبد المغنی نے ذہن رسا پایا تھا اس پر ان کے والد مولانا عبد الروف ندوی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا کہ مولانا موصوف خود بھی اپنے شہر (اورنگ آباد بہار) کے مفتی، جید عالم اور محقق و دانشور تھے چنانچہ عبد المغنی زمانہ طالب علمی ہی سے ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے نہایت صاف کو کھرے بلکہ بعض اوقات کھرے اور احساس برتری سے سرشار ہو جاتے۔ لباس میں گھر پر کرتا پائجامہ مگر باہر نکلتے تو علی گڑھی پائجامہ کرتے پر شیروانی اور ہم رنگ ٹوپی کو بھی کئی بار جھاڑ کے پہنتے۔ پمپ شو بغیر موزہ کے کبھی نہیں پہنتے۔ اور موزے کو ہی نہیں اپنے رومال کو بھی کئی کئی بار جھاڑ کے

استعمال کرتے ۔میں نے اپنی یاد میں دو افراد کو پچاسوں برس تک اس طرح دیکھا کہ کبھی کسی سے مرعوب نہ ہوئے بلکہ اپنے گفتار و کردار سے دوسروں کو مرعوب کیا ایک عبدالمغنی اور دوسرے ان کے سینئر ساتھی مولانا ارتضاءالدین حاذق ضیائی سہسرامی، ملک بھر میں شاید مولانا ارتضا ہی تھے جو عبدالمغنی صاحب کو ہمیشہ ''تم'' کہہ کے خطاب کرتے اور عبدالمغنی صاحب اس کا برا بھی نہیں مانتے تھے ۔ایم اے کے بعد اپنے ابتدائی دور ملازمت (بی۔این کالج اور سائنس کالج پٹنہ) میں گاہے گاہے شرٹ اور پینٹ بھی زیب تن کئے مگر جلد ہی یہ لباس تقریباً متروک ہوگیا۔خیال آتا ہے کہ بیسیوں برس قبل ڈاکٹر ذکی کرمانی صاحب نے بعض نوجوان اسکالرس کے تعلیمی و تربیتی پروگرام میں لکچرس کے لئے ہم دونوں کو علی گڑھ مدعو کیا۔ 4-3 روز قیام رہا آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ فی لکچر کچھ معاوضہ بھی طے تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نے طے کیا کہ علی گڑھ کی شیروانی سارے جہاں میں مشہور ہے کیوں نہیں کپڑے خرید کے سلوالی جائے۔مگر ہم لوگ قبل از وقت کسی معاوضے کا مطالبہ نہیں کرسکتے تھے اور اتنے پیسے تھے نہیں کہ کپڑے کی خریداری کر کے ٹیلر ماسٹر کے سپرد کرتے ۔ڈاکٹر ابن فرید صاحب ہمارے بے حد مخلص اور بے تکلف مشترک دوست تھے ۔انہوں نے ہماری مشکل بھانپ لی چنانچہ مختلف لطیفے اور چٹکلے سناتے ہوئے بازار لے گئے کپڑے خریدوا کے سب سے اچھے درزی کو دونوں کے اندر تیار کرنے کی تاکید کردی۔ہمارے شکریہ ادا کرنے پر موصوف نے کہا اس میں شکریے کی کیا بات ہے پرسوں آپلوگوں کو رقم ملے گی تو وصول ہوجائے گی۔''یہ قرض حسنہ'' نہیں ہے کہ قرض کا مطالبہ کرنے پر آپ لوگ ''ہنس'' کے ٹالدیں گے''۔ہم نے ان کا دوبارہ شکریہ ادا کیا۔

عبدالمغنی صاحب تحریر کی طرح گفتگو بھی نہایت منظم و مربوط انداز میں کرتے۔ کوئی مقالہ ہو یا انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں تجاویز کی ترتیب قلم برداشتہ کرتے جسے دوبارہ صاف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ۔یاد آتا ہے کہ دسیوں برس قبل ہمارے پڑوسی

دوست ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب اتفاقاً پٹنہ کے سفر میں ساتھ ہو گئے۔ دوران سفر عبدالمغنی صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر آگیا تو کہنے لگے کہ ان کی تحریریں تو بہت دیکھی ہیں۔ اطمینان سے گفتگو کا آجتک موقع نہیں ملا۔ کیوں نہیں آپ کے ساتھ ان سے مل لیں۔ چنانچہ طے شدہ وقت کے مطابق ہم دونوں سائنس کالج کیمپس کے کوارٹر میں ان سے ملاقات کے لئے صبح 8 بجے پہنچے۔ تھوڑی دیر میں سینکے ہوئے ٹوسٹ کے ٹکڑے، تلے ہوئے انڈے اور نفیس قسم کی سادہ چائے آگئی اور اپنے ناشتے میں ہم دونوں کو بھی نہایت محبت سے شریک کرلیا۔ اس سے برسوں قبل جب وہ سلطان گنج وارثی گنج کے ایک کرایہ کے مکان میں تھے اور اس وقت تک ان پر بلڈ پریشر کا کوئی حملہ نہیں ہوا تھا تو پٹنہ کے گاہے گاہے سفر میں ملاقات کے دوران صبح سویرے ناشتہ پر ضرور مدعو کرتے۔ ان دنوں ان کی مرغوب غذا، پوستہ دانے سے بھری گھی سے تر کی ہوئی روٹیاں بعض لذیذ اچار اور چٹنیوں کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔

بہر حال گھنٹوں ملک وملت اور زبان وادب کے مختلف مسائل پر باتوں کے بعد ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب کے ساتھ واپس ہوئے تو دروازے تک از راہ محبت معمول کے مطابق چھوڑنے آئے۔

عبدالمغنی صاحب کے جاتے ہی ڈاکٹر آفتاب صاحب نے چھوٹتے ہی کہا کہ ''سجاد صاحب'' کمال ہے مغنی صاحب کی گفتگو بھی مقالہ کی طرح منظم ومربوط ہوتی ہے۔''

میں نے ان کی تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہر مسئلہ پر عبدالمغنی صاحب کی ایک سوچی سمجھی اور پکی تلی رائے ہوتی ہے۔ جس کا وہ برملا اظہار کرتے ہیں۔ جس سے اگر اختلاف کیا جائے تو وہ دیر تک بحث ہی نہیں مناظرہ کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس ضمن میں میں نے اپنا ایک واقعہ سنایا تو وہ خاصے محظوظ ہوئے۔

عراق اور صدام حسین پر امریکی حملے کا زمانہ تھا۔ انجمن ترقی اردو بہار کی مجلس

عالمہ کی نشست ختم ہو چکی تھی اور مختلف احباب الگ الگ ٹولیوں میں محو گفتگو تھے۔ میں عبد المغنی صاحب سے گفتگو کر رہا تھا، پتہ نہیں کس سیاق میں عراق کا تذکرہ آ گیا اور میں نے امریکی مکاری اور ظلم و ستم کو تسلیم کرتے ہوئے صدام حسین کے کویت پر حملہ اور امریکی سازش کے شکار ہونے پر تنقیدی زبان استعمال کی تو مغنی صاحب باضابطہ بحث پر آمادہ ہو گئے صدام حسین کی طرفداری میں مسلسل بلند آواز میں برہمی کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ وہ مسئلہ تو اندنوں میڈیا میں چھایا ہوا تھا ہی میں نے اپنے دلائل دیئے اور مغنی صاحب نے ان کی نفی اس انداز سے کی کہ حاضرین کی مختلف ٹولیاں ہمارے مباحثے کو سننے میں محو ہو گئیں۔ تقریباً 45 منٹ تک ہماری بحث جاری رہی بالآخر ایک لطیفے پر اس بحث کو ختم کیا گیا۔ مغنی صاحب روانہ ہو گئے تو عزیز الحسن مرحوم نے برجستہ کہا کہ "آج معلوم ہوا کہ ابھی کچھ لوگ ہیں جو مغنی صاحب سے بھی گھنٹوں کسی مسئلہ پر بحث کر سکتے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب اس واقعہ کو سن کے محظوظ ہوئے کہنے لگے ایسا واقعہ پھر نہیں ہوا ہوگا میں نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان تقریباً ہر معاملہ اور مسئلہ میں بڑی فکری و علمی ہم آہنگی پائی جاتی تھی اس لئے کبھی کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ ایک بار مشہور نقاد اور فکشن نگار پروفیسر حسن عسکری (پاکستان) کے صوفیانہ خیالات پر ان کا شائع شدہ مقالہ پڑھا تو مجھے ان کے بعض سخت الفاظ اور جملوں پر بڑی ناگواری کا احساس ہوا تو میں نے انہیں ایک مختصر خط میں لکھا کہ ہر صاحب فکر کو کسی صاحب فکر سے اختلاف کا حق ہے مگر ایک تعمیری و اسلامی فکر کا دانشور اگر صوفیانہ مسائل کے بعض پہلوؤں میں مبالغہ آمیز رائے رکھتا ہے تو اس پر تنقید اس طرح تو نہ کی جانی چاہئے۔ جس طرح کسی اسلام دشمن آرا رکھنے والوں پر کی جاتی ہے میں سوچتا ہوں کہ حسن عسکری صاحب کے مسئلہ پر آپ سے "دوستی میں ایک (نورا) کشتی ہو جائے" اور ایک مقالہ لکھنے کا میں نے پورا ارادہ کر لیا تھا۔ مغنی صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ حسب ضرورت مختصر یا طویل جواب فوراً بھیجتے تھے۔ میرے اس خط کا انہوں نے مختصر

جواب ایسا لکھا کہ مجھے اپنا ارادہ بدل دینا پڑا۔انہوں نے لکھا کہ

"عمر بھر تو دشمنوں سے (قلمی) کشتی ہوتی رہے۔

کیا اب دوستوں سے بھی ایسا کرنا ہمیں زیب دیتا ہے"؟

عبدالمغنی صاحب کی تحریر وتقریر میں آج بھی بعض خامیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے محض جذباتی طور پر یا نادانی میں ایسا لکھا یا کہا: وہ جو کچھ لکھتے یا کہتے تھے اس میں سوچ بچار کے علاوہ خلوص وایمانداری کی شفافیت بھی ہوتی تھی اس لئے بدعنوانوں اور غلط کاروں کی کمزوریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کی پوشیدہ صلاحیتوں سے آخر وقت تک مثبت انداز میں کام لینے یا ساتھ لیکر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ غلام سرور صاحب کے ساتھ اردو تحریک کو بہار میں آگے بڑھانے کا کام مغنی صاحب آخر وقت تک کرتے رہے مگر جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب اردو کا زاور اس تحریک کو نقصان پہنچنے لگا ہے تو مجبوراً ان سے کنارہ کش ہو کے پورے ملک میں سب سے پہلے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں کامیابی حاصل کی اور بہار شریف کی آل بہار اردو کانفرنس (زیر اہتمام انجمن ترقی اردو بہار) منعقدہ 1979ء میں وزیر اعلیٰ بہار مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے انہیں صاف صاف جتا دیا کہ وزیر اعلیٰ بہار اگر اردو کو اس کا دستوری حق دوسری سرکاری زبان کا منظور کرتے ہیں تو وہ ہمارے بیشک سیاسی حلیف ہیں لیکن اگر نا منظور کرتے ہیں تو پھر ہم ان کے حریف ہیں۔اور اسی کانفرنس میں وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگناتھ مشرا کو برملا اعلان کرنا پڑا کہ ہم اس جائز مطالبے کو منظور کرتے ہیں چنانچہ اگلے اسمبلی سیشن 1980ء میں اسے قانونی حق کے طور پر دو قسطوں میں پہلے ابتدائی پندرہ اضلاع اور دوسری قسط میں باقی ماندہ اضلاع (بشمول اضلاع جھارکھنڈ کہ اسوقت تک اس ریاست کی تشکیل نہیں ہوئی تھی) میں اصولی طور پر حاصل ہو گیا جس کے نتیجے میں آج ملک بھر کی 8-7 ریاستوں میں اردو کا یہ قانونی حق تسلیم کیا جا چکا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ خود اردو

والوں کی کمزوری اور سیاسی منافقانہ ماحول کے سبب اس پر پوری عمل آوری باقی ہے۔

پچھلی صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی تک فرقہ وارانہ صورتحال اور اردو کے خلاف جو زہر آلود فضا تھی سچ تو یہ ہے کہ اس سخت ترین ماحول میں لکھنؤ کا آل انڈیا اجلاس ہو یا آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی طرف سے وزارت کی پیش کش، یا ایمرجنسی کا ظالمانہ ماحول یا میتھلا یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں انہیں گہری سازش کے ساتھ جیل جانے کی نوبت ہو، ہر موقع پر عبدالمغنی صاحب نے اپنی "مومنانہ شان" میں سرِ مو فرق نہ آنے دیا۔

ہم لوگ اکثر یہ تذکرہ کرتے ہیں کہ ان کے حلقہ احباب اور معتقدوں نے بہر صورت اپنے مکان، سیاسی دوکان اور عہدے مرتبے تو خوب خوب حاصل کئے۔ مگر مغنی صاحب آخر عمر تک پٹنہ میں کرایے کے مختلف مکانوں میں منتقل ہوتے رہے۔ اپنی تنخواہ سے بال بچوں کی عمدہ تربیت اور اعلیٰ تعلیم میں تو کمی نہیں آنے دی مگر زمین جائیداد یا مکان کے چکر میں کبھی نہ پڑے۔

مگر پٹنہ میں اردو بھون کی تعمیر بھی وزیر اعلیٰ کے سامنے نہایت ہی باوقار بلکہ بارعب انداز میں رکھا با آخر بنوانے میں کامیاب رہے۔

اندرا گاندھی نے اپنی الیکشنی اور سیاسی دھاندلیوں کی پردہ پوشی کے لئے ہٹلری ایمرجنسی لاگو کر دیا اور اکثریتی آبادی کو خوش کرنے کے لئے آر ایس ایس وغیرہ پر پابندی عائد کرنا چاہا تو توازن قائم کرنے کے لئے بلا جواز جماعت اسلامی ہند پر بھی پابندی عائد کر دی۔ چنانچہ دہلی کے ہٹلری فرمان کے تحت ملک گیر پیمانے پر ارکان جماعت کی اندھا دھند گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ شمالی ہند کی ریاستوں میں بطور خاص سختی سے کام لیا گیا۔ بہار کے سیکڑوں ارکان جماعت جیل بھیج دیے گئے تو حسب مشورہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے بیسوں ایم ایل اے اور بعض وزرا کا ایک وفد خاکسار نے سہیل احمد خاں کو ساتھ لے کر پٹنہ

میں ایک ہفتہ کیمپ کر کے وزیر اعلیٰ جگناتھ مشرا کے بنگلہ پر لے گیا تو مشرا جی حیران رہ گئے ۔اس وفد کے متکلم یا سربراہی عبدالمغنی صاحب کو دی گئی۔ میں نے گرفتار شدہ ارکان کی فہرست پیش کر کے اس المناک دھاندلی کا تذکرہ کیا اس کے بعد عبدالمغنی صاحب نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ اپنی ٹوپی سر سے اتار کے ٹیبل پر رکھی اور مشرا جی کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ''کیا ایمرجنسی کا یہ مطلب ہے کہ انصاف اور انسانی حقوق کا دن دھاڑے خون کیا جائے اور فرقہ پرستوں کے ساتھ ایک خالص دینی جماعت کے غریب اور مزدور قسم کے ارکان کو بھی پوری بے حیائی کے ساتھ سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے''؟ مشرا جی نے بڑی عاجزی کے ساتھ معذرت کی کہ یہ سب کچھ مرکزی حکومت کے حکم اور ایما سے ہوا ہے، ریاستی حکومت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے ۔آپ نے اچھا ہوا فہرست دیدی ہے میں جلد انکوائری کر کے جو کچھ ہو سکتا ہے کروں گا۔

اس مشکل کی گھڑی میں جماعت اسلامی ہند کے بہت سے ہمدردان اور قریبی جانثاروں کا بھی پتہ پانی ہو گیا تھا چنانچہ ان کا آنا جانا تو دور، سلام کلام میں متعدد حضرات بے حد محتاط ہو گئے تھے ۔عبدالمغنی صاحب کی بعض باتوں کے علاوہ ہم میں سے بہت سے لوگ ان کی کانگریس دوستی کو غلط سمجھتے تھے اور بعض تو سخت معترض بھی تھے ۔مگر موصوف کے اپنے دلائل تھے کہ وہ کیوں اس پارٹی کے حمایتی ہیں ۔اس حمایت اور سیاسی نقطہ نظر کے باوجود انہوں نے اعلانیہ مظلوموں کی حمایت کی اور زبان وقلم سے جماعت کی ہمیشہ طرفداری کرتے رہے اور کبھی کسی طرح کے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کی گرفتاری کے بعد عالم گنج کی مسجد میں خطبہ جمعہ اور امامت کی جو جگہ خالی ہوئی اسے مغنی صاحب نے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ پر کیا۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ (صدر شعبۂ اردو کوگری کالج) ڈاکٹر مظفر اقبال صاحب (صدر شعبہ اردو بھاگلپور یونیورسٹی) ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب اور راقم الحروف نے اپنی طالب علمی

کے اواخر میں یہ ذہن بنالیا تھا کہ ہملوگ جماعت کی رکنیت تقریباً ایک ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ حسنین صاحب، انیس الدین احمد صاحب، ڈاکٹر عبد الفتاح صاحب وغیرہ جیسے اکابرین تحریک کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا جا سکے۔ چنانچہ عبد المغنی صاحب نے رکنیت فارم کی خانہ پری کر کے براہ راست درخواست دہلی مرکز جماعت کو بھیج دی۔ مرکز نے حسب ضابطہ دفتر حلقہ بہار کو اور دفتر حلقہ نے امیر مقامی کے پاس بھیج دیا اور جماعتی حلقے میں اس راست ترسیل پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں جس سے مغنی صاحب کو تکلیف اور کچھ دنوں تک ان کے جماعتی تعلقات کشیدہ بھی رہے۔ جس کو رفع کرنے میں مولانا ارتضا صاحب نے مثبت رول ادا کیا اور جلد ہی سب کچھ فراموش کر کے مغنی صاحب نے تحریک اور جماعت سے اپنے تعلقات کو معمول کے مطابق متوازن کر لیا۔

رانچی اور چھوٹا ناگپور انجمن ترقی اردو نیز یونیورسٹی اور مختلف سمینار و سمپوزیم کے موقع پر ہملوگ انہیں برابر رانچی مدعو کرتے رہے۔ سنت زیورس کالج میں ایک بین المذاہب مذاکرہ میں اسلام کی نہایت جرأتمندانہ نمائندگی کی تو فرقہ پرست دانشوروں نے طرح طرح سے انہیں دھمکانے اور ڈیمورلائز (Demorlise) کرنے کی بھی کوشش کی۔ مگر ڈرنے کے بجائے ان کے ایمانی جذبے میں اور جوش بھر گیا چنانچہ معترضین کو مسکت جواب دیا۔

انجمن ترقی اردو چھوٹا ناگپور کی شاندار کانفرنس کو سنر تھیولوجیکل ہال میں منعقد کی گئی پورے علاقے میں مہینوں قبل سے دورے کئے گئے، پوسٹر چھپوائے گئے۔ اسوقت انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری کلام حیدری صاحب تھے۔ اس کانفرنس کے موقع پر بعض مسلم محلے کے نوجوانوں کو طرح طرح کے پروپگنڈے کر کے بھڑکایا گیا تا کہ کانفرنس ناکام ہوجائے۔ چنانچہ چند منٹوں کے لئے خاصا انتشار رہا۔ جس پر قابو پانے میں کلام حیدری

صاحب سے زیادہ مغنی صاحب کی فراست نے موثر رول ادا کیا۔

رانچی کی آب وہوا انہیں بہت پسند تھی کہتے تھے کہ یہاں انجمن ترقی اردو کی ایک مضبوط و مستحکم شاخ قائم کر کے اردو زبان وادب کی ایک مبسوط تاریخ اس طرح مرتب کی جائے کہ اب تک کی تاریخوں کی بے سمتی یا استحصالی رخ کے قبلہ کو درست کرلیا جائے۔

ان کے ہم وطن پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب اس زمانے کے نائب صدر انجمن کو اس علاقے کا بنیادی ذمہ دار بنا کر انہیں ''مجذوب اردو'' کا لقب دیا تھا اپنی گفتگو اور کبھی کبھی خطوط میں بھی دوستانہ انداز سے انہیں اسی طرح یاد کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دسیوں برس سے اسی ''مجذوب اردو'' نے جھارکھنڈ میں اردو کا علم انتہائی نامساعد حالات میں بھی بلند کر کے رکھا ہے۔

اس خاکسار سے بھی موصوف کو غایت محبت اور اخلاص کا تعلق تھا۔ اپنی بیشتر کتابیں اشاعت کے ساتھ ہی عنایت کرتے۔ ان کی مشہور ومعروف تصنیف ''تشکیل جدید'' (تنقیدی مقالات کا مجموعہ) اواخر 1976ء میں شائع ہوئی تو 30 نومبر 76ء کو ان الفاظ کے ساتھ بھیجی۔

''برادرم ڈاکٹر احمد سجاد کے لئے
جو وادیٔ غیر ذی زرع میں ''تعمیر بیت اللہ''
کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ عبدالمغنی

ادب، تاریخ، سیاست، صحافت اور مذہب ان کے مخصوص موضوعات تھے۔ ان موضوعات پر کئی درجن وقیع کتابوں کے مصنف بھی ہوئے۔ مگر ان کا پہلا اور سب سے محکم قلبی وقلمی تعلق ادب سے آخر عمر تک رہا نظم ونثر میں اردو ادب کی شاید ہی کوئی ایسی وقیع شخصیت رہی ہو جس پر انہوں نے چھوٹے یا بڑے مضامین ومقالات یا مستقل تصانیف نہ شائع کی ہوں۔ ادبی شخصیات میں غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی کو تو

وہ رسیا تھے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہوں یا ڈاکٹر خلیق انجم سبھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عبدالمغنی صاحب مغربی و انگریزی ادب سے مستفید ومتاثر تو ضرور ہوئے مگر مرعوب کبھی نہیں ہوئے۔انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں جدت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔سچ تو یہ ہے کہ تعمیری و اسلامی ادب اور فکر ونظر پر برصغیر میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے مگر عبدالمغنی کے مقابلے میں کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے اب تک ان کا کوئی ثانی نہیں۔

انہوں نے نظری و عملی تنقید کا ایک بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے جس کی بازیافت ہنوز باقی ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ ان پر متعدد تصانیف پی ایچ ڈی کی ڈگریاں، خصوصی شمارے اور مستقل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں مگر ان کے تنقیدی تصورات، ادب کی تشکیل جدید اور اردو ادب میں مشرق کی بازیافت" پر عصری تناظر میں ازسر نو صاحبان ادب وتنقید کو غور وفکر کے بعد لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے۔

عبدالمغنی صاحب نے عمر بھر بھی ایک واضح تصور اور ایک متعین نقطہ نظر کے ماتحت پرورش لوح وقلم کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ان کے خیال میں "تنقید ہمیشہ کسی تصور کے تحت کی جاتی ہے، جو ادب کے کسی بھی تجزیے میں ایک معیار کا کام کرتا ہے" (تصورات ص 7) چنانچہ اردو تنقید کے ایک اہم ترین ستون اور اپنے استاد گرامی کلیم الدین احمد کا اردو ادب میں ان کے مقام کا تعین کرتے وقت (تنقید مشرق 1987ء) ان کی خوبیوں اور خامیوں پر بے لاگ تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "میرا خیال ہے کہ کلیم الدین احمد نے ایسے تنقیدی افکار کی اشاعت میں بہت کم حصہ لیا جن کی روشنی میں پرورش ذوق اور تربیت شعور کی وہ ادبی فضا بنتی ہے جس میں اچھے اور بڑے ادب کی تخلیق بھی ہوتی ہے۔اور قدر شناسی بھی اس طرح انہوں نے تنقید کا سب سے بڑا فریضہ انجام نہیں دیا۔" (تنقید مشرق ص 49)

اس کمزوری کی وجہ مغنی صاحب کے خیال میں یہ ہے کہ

''تحقیق، شاعری اور سوانح عمری کے دائروں میں کلیم الدین احمد کی کاوشیں بہت ہی معمولی ہیں اور ان کا جو کچھ ادبی سرمایہ ہے تنقید ہی ہے۔ یہ تنقید بھی اصلاً اولاً اور عموماً عملی تنقید ہے اور کسی معین تصور ادب اور واضح اصول تنقید سے خالی ہے'' (تنقید مشرق ص 37)

''جدید ادبی تنقید کے مسائل'' (تنقید مشرق ص 73 تا 85) میں ادیب کے ذہن تک رسائی، حقیقی جدت اور نقلی تجدید، تنقید و تحقیق کے فرق، جدید و قدیم تنقید کے امتیازات اور فکر و فن کے توازن نیز زندگی کی جامعیت کے شعور اور ذوق کے عام ہونے اور ''مشغل مشترک'' پر گفتگو کرتے ہوئے تقریباً تمام ہی اہم ترین اصناف سخن اور ناقدوں پر بڑے جچے تلے الفاظ میں ان کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کی رائے میں ''انگریزی میں ڈرامے، عربی میں قصیدے، فارسی میں مثنوی اور اردو میں غزل کی امتیازی شان کا راز یہی ہے۔ اسی طرح مغرب میں تمثیل اور مشرق میں تغزل کی کیفیات کا غلبہ اسی عمرانی حقیقت پر مبنی ہے'' (ایضاً ص 74) احتشام حسین کی مارکسیت اور عسکری وغیرہ کے مکتب کو زوال پسند (Decadent) کے مفہوم میں جمالیاتی قرار دیا ہے، اسی طرح وحید اختر کی فلسفہ طرازی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے لفظیات کا چکر، جدید ناقدوں کے مطالعہ کا سوء ہضم، بعضوں کی انشا پردازی اور جملہ بازی، کلیم الدین احمد کے یہاں پیروی مغرب کی تکمیل یونانی و بعض صنمیات و خرافات، نقوش اولین با امثلۂ قدیم (Archetypes) کی بسیط پراگندہ خیالی، وزیر آغا کی جمالیت و عمرانیت پسندی کا خلط مبحث ابن فرید کی عمرانیات کے وسیلے سے اخلاقی اقدار کی دریافت، آل احمد سرور کی راہ اعتدال، اختر اورینوی کی آفاقی و معنوی کے ساتھ روحانیات و اخلاقیات، وقار عظیم کا حقائق کی تنقیح و تفہیم، مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی لسانیات، یوسف حسین خاں اور سید عابد حسین کی محققانہ کاوش پر مدلل

بحث کرتے ہوئے ایک اہم تنقیدی نکتہ یہ بیان کیا کہ: ''حالی وشبلی کی تنقید نے میر وغالب کی تفہیم کے لئے ایک ایسی فضا بنائی جس میں باذوق قارئین کے ساتھ ساتھ علماء ومحققین پیدا ہوئے اور انہوں نے مل کر حالی وشبلی سے قبل کے اردو ادب اور اسکی عظیم شاعری کے مطالعہ کی راہ ہموار کی'' (ایضاً۔83)

مغنی صاحب کے خیال میں اردو تنقید کا جدید ذہن منحرف ہوگیا اس لئے اس نے جمالیات اور اخلاقیات کو ایک دوسرے سے مبرا کر دیا جس کے نتیجے میں اقبال کا تجربہ تو جمالیات واخلاقیات کا ایک متوازن مرکب بنا کے فن کا جادو جگایا اور اپنے مقاصد اعلیٰ میں سو فیصد کامیاب رہے لیکن ''تنقید اور اسکی قدر شناسی میں یکسر ناکام رہی۔'' مشرقی تہذیب اور اردو شاعری اور نثر کی پوری طاقت اور نفاست کا ظہور ان کی نظر میں اردو کے چار نابغۂ روز گار فنکاروں کے یہاں ہوا۔ وہ ہیں شبلی، اقبال، ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی، اور برملا مدلل اعلان کرتے ہیں:۔

> ''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اقبال دنیا کے بہترین شاعر اور ابو الاعلیٰ مودودی بہترین نثار ہیں۔ مفکر کی حیثیت سے بھی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں اس صدی (بیسویں) کا سب سے بڑا دماغ سمجھتا ہوں۔'' (ایضاً اردو ادب میں مشرق کی بازیافت ص 181)

عبدالمغنی صاحب جسم وروح فکر وفن اور خیال وعمل کا سب سے زیادہ متوازن نظریہ ونظام اسلام کو سمجھتے تھے کیونکہ تجربہ وایثار اور انفرادیت واجتماعیت کی جو ہم آہنگی اسلام میں ہے وہ کسی اور نظریہ ونظام میں موجود نہیں اسلام ایک ازلی وابدی پیغام ہے۔ جو انسان کو سیاروں اور ستاروں سے آگے بڑھا کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیتا ہے، بندے کو خدا کے قریب لے آتا ہے اور موت کو زندگی کا پیش خیمہ بنا دیتا ہے:۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی　　اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اسلامی نظریے کی یہ تحسین وستائش مسلمان اور عالم دین ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے وسیع مطالعہ اور مغرب ومشرق کے سیاسی وسائنسی، عمرانی وادبی اور تاریخی مطالعہ و تحقیق کی بنیاد پر کی ہے۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں جابجا یونانی فلسفیوں سے لیکر برٹرنڈ رسل ، کیرکیگارد، مارکس، فرائیڈ، ٹوائن بی، آئن اسٹائین کے علاوہ ہیوم، ازرا پاؤنڈ، میتھو آرنلڈ، رینسم، کیٹس، شیکسپیئر ، وجودیت ، اشاریت، علامتیت ، آرکٹائپ، پروٹوٹائپس، آبجیکٹو کو ریلیٹیو، (معروضی مترادف) آئیڈیوگراف (نقش خیال) روماٹیک، ریوائیول (احیاء رومانیت) مینافیزیکل (مابعد الطبعیاتی) تحریک، رومانٹیسزم (رومانیت) موڈرنزم، کلاسزم (جدیدیت، کلاسکیت) مسٹی سزم، (تصوف) غرض ادب سے متعلق کم وبیش تمام مغربی و مشرقی افکار ونظریات اور اہم شخصیات کے تجزیاتی وتقابلی مطالعہ کے بعد ہی اقبال کے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے طرز پر انہوں نے ''ادبی تشکیل جدید کے اسباب وعوامل'' (تشکیل جدید 271) میں تفصیلی اظہار خیال کے بعد ''شاعری کی تشکیل جدید' کا ایک پورا خاکہ (ایضاً 341) پیش کیا ہے۔ عبدالمغنی صاحب کی تنقید کا ایک بڑا وصف ان کا تخلیقی انداز بیان ہے۔ آپ بھی سماعت فرمائیں اور ہماری طرح محظوظ و مستفیض ہوں۔

> '' شاعری بنیادی طور پر ایک نغمہ ملفوظ ہے ۔ کائنات کی پہنائیوں میں ہر وقت ایک مسلسل موسیقی کی لہریں چلتی رہتی ہیں۔ فضا کبھی ہواؤں سے خالی نہیں ہوتی۔ نسیم وصبا کی دھنیں ہمہ دم بجتی رہتی ہیں۔ ہر سانس لینے والی مخلوق کی رگوں میں راگ ہے، قسم قسم کی آوازوں سے کائنات گونج رہی ہے۔ صبح وشام، روز وشب کے اپنے اپنے آہنگ ہیں، زندگی ایک ساز ہے، صداؤں سے بھرا ہوا اور شاعری کے رگ وپے میں یہی آفاقی نغمہ جاری وساری ہے۔ ہر شعر ایک گنگناہٹ ہے، ہر مصرعے میں الفاظ کی نشست وبرخاست ترنم کی کسی نہ کسی قماش کے تحت ہوتی ہے اور

ہر لفظ جو کسی مصرع شعر میں آتا ہے اپنا ایک لحن بنالیتا ہے، ایک شعر کے تمام الفاظ کی حرکات وسکنات ایک آہنگ کے تحت متعین ہوتی ہیں۔ شعر میں تلفظ کی اہمیت اس کے داخلی ترنم ہی پر مبنی ہے۔ شاعری کی بنا عروض پر اور عروض کی بنا پر موسیقی پر جب کہ دوسری طرف موسیقی بغیر شعریت کے ممکن نہیں"۔

ع شعر گویا روح موسیقی ہے، رقص اس کا بدن (اقبال)

"..... ایک زبان کی پوری شاعری، از ابتداء تا زمانہ حال، ایک بسیط نغمہ ہے، جو ہر قیمتی تجربہ کے ساتھ وہ جس دور میں بھی ہو، برابر بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے اور کوئی نیا سُر اگر اس نغمہ عام کا جز بن کر اس میں جذب نہ ہو سکا تو وہ بہت جلد نقش بر آب یا صدا صحرا کی طرح گم ہو جائے گا"۔

کاش اردو کی جدید شاعری کے نئے سُر اپنی روایت شعری کے نغمۂ عام سے ہم آہنگ ہو کر اس میں توسیع و اضافہ کر سکیں۔" (ایضاً ص: 433)

مولانا ارتضاءالدین حاذقؔ ضیائی سہسرامی۔ایک مردقلندر

مولانا ارتضا صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۷ء میں پٹنہ میں ہوئی۔پہلی ملاقات کی تفصیل تو یاد نہیں البتہ ان کا حلیہ پہلی ہی نظر میں کھب گیا جس میں آخر وقت تک سر مو کوئی فرق نہیں آیا سوائے اس کے کہ ۵۷ء میں ان کے سر کے بال اور بھرکلہ یک مشت دو دو انگشت کی ڈاڑھی سفید کے بجائے بالکل کالی تھی۔ان کی بڑی بڑی روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، چیچک رو دبلے پتلے اوسط قد اور سانولہ رنگ، آواز صاف اور واضح ہی نہیں خود اعتمادی سے بھرپور اور پاٹ دار دیکھنے میں کوئی خاص کشش نہیں لیکن برتنے کے بعد نہایت پرکشش بے ریا اور مخلص ترین بہ الفاظ دیگر سادگی، بیبا کی ذہانت اور علمیت ان کی شخصیت کے عناصر اربعہ کہے جاسکتے ہیں۔دفتر حلقہ پٹنہ میں ایک اور موقع پر ہم چند احباب بیٹھے محو گفتگو تھے کہ مولانا اپنے تحریکی علاقے کے سفر سے ایک تھیلہ لیے ہوئے واپس آتے ہی بے محابا پائجامے کا ازار بند کھولنے لگے۔ہماری حیرت اسوقت مسکراہٹ میں بدل گئی جب یہ دیکھا کہ پائجامے کے اندر سے مولانا لنگی میں ملبوس نظر آئے۔سراپا تحریک اور مجسم اخلاق یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا تعلیماً بریلوی، مسلکاً حنفی، فکراً تحریکی، عقیدتاً کسی مکتبہ فکر سے مرعوب نہیں اور طبعاً نزلاوی اور جسماً نحیف، بڑے حساس اور قدرے تنک مزاج بھی تھے، ایک موقع پر دفتر حلقہ میں ہم چند احباب مولانا کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تذکرتاً یہ بات آئی کہ مولانا پٹنہ کمشنری کے ناظم ہیں اور ان کے ماتحت سات اضلاع ہیں۔ نسیم احمد صاحب نے میرے کان میں کہا کہ تب تو مولانا شہنشاہ ہفت اقلیم ہوئے۔سنتے ہی مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔لوگوں کے اسرار پر جملہ دہرادیا تو سب لوگ محظوظ ہوئے مگر مولانا

نے سب کو ڈانٹنا شروع کیا۔ان کی قائدانہ صلاحیت کے آثار طالب علمی ہی کے زمانے سے نمایاں ہونے لگے تھے۔مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام کی جمعیۃ الطلبا کے صدر منتخب کئے گئے۔ متولی کی غلط کاری پر بھوک ہڑتال کروادی اور مولانا مبارک کریم صاحب ڈائرکٹر اسلامک ایجوکیشن بہار واڑیسہ کو مدلل شکایت نامہ بھی بھجوایا۔برسوں قبل ابتدائی درجات میں ڈائریکٹر صاحب موصوف نے جب یہ مزاحیہ سوال طلباء سے کیا تھا کہ "خدا کیا کھاتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟ تو اس کا جواب دیکر ارتضا صاحب ان کا دل جیت چکے تھے۔چنانچہ ڈائریکٹر صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد صفات احمد صاحب اس عہدے پر فائز ہوئے تو ان سے بھی ان کا گہرا ربط تھا۔ان سے بہت سی انتظامی خبریں انہیں ملتی رہتی تھیں۔

مدرسہ خانقاہ کبیریہ سے ۱۹۵۲ء میں عالمیت کے بعد اسی سال درجہ فاضل حدیث میں ان کا داخلہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہوگیا۔ان دنوں اس کے پرنسپل مشہور مورخ تاریخ اسلام اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے شاگرد مولانا ریاست علی ندوی تھے۔ جنہیں بعض شوخ طلباء ان کے قوم پرستانہ نظریات کی وجہ سے انہیں اسٹیٹ علی ندوی بھی کہا کرتے تھے۔عجب اتفاق کہ داخلہ لینے کے چھ ہی مہینے کے بعد یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر پرنسپل مدرسہ نے پہلی بار قومی پرچم کشائی کے وقت طلباء اور اساتذہ کے لئے اس کے اعزاز میں کھڑا ہونا لازمی قرار دیدیا تو جیسے پورے مدرسہ میں بھونچال سا آگیا ان دنوں مولانا مدرسہ ہوسٹل کے یونین سکریٹری تھے۔قومی پرچم کی سلامی کے وقت مولانا سید احمد عروج قادری صاحب اور ڈاکٹر ضیا الہدیٰ صاحب (جماعت اسلامی ہند بہار کے سابق امیر حلقہ) کے بھائی جلسہ گاہ میں بیٹھے رہے جس پر پرنسپل مدرسہ نے قانونی کاروائی کا آغاز کیا۔اساتذہ کا اخراج اور طلباء یونین کو برخاست کردیا گیا۔تو پورے مدرسہ میں پرنسپل کی اس "زیادتی" پر ایک ہنگامہ مچ گیا۔ہوسٹل کے طلباء نے بھی ساتھ دیا جس کی قیادت مولانا

ارتضا صاحب کر رہے تھے، عبدالمغنی صاحب نے ان سے دو سال جونیئر عالمیت کے طالب علم تھے۔ طلباء سے ہوسٹل خالی کرالیا گیا اور تالہ بندی کر دی گئی تو وہ طلباء مسجد نوری میں آ گئے۔ طلباء کا کھانا اہالیان شہر نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یہ ہنگامی سلسلہ چھ ماہ تک چلتا رہا۔ عبدالمغنی صاحب کچھ دنوں تک ارتضا صاحب کے سرگرم معاون رہے بعد میں عالمیت کے بعد ان کے والد بزرگوار مولانا عبدالرؤف صاحب نے انہیں گھر واپس بلا لیا۔ مدرسہ کے پرنسپل نے ہڑتالی طلباء کے خلاف طرح طرح کے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی لگایا کہ یہ طلباء جماعت اسلامی سے متاثر ہیں۔ طلباء اور شہر کے بعد ہمدردان مصر تھے کہ پرنسپل کو برخاست کیا جائے۔ اخبار بازی اور سرکاری وغیر سرکاری لیٹر بازی کا بھی مہینوں سلسلہ رہا۔ بعض اخباری تراشے وزیر تعلیم حکومت ہند مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی بھیجے گئے جس پر ایک خط مولانا آزاد کا بھی موصول ہوا۔ آخر یہ جھگڑا مقامی تھانے تک پہنچا جہاں وزیر تعلیم کا خط ان کی گلوخلاصی میں بڑا کام آیا۔ اور تھانے دار نے کسی کڑی کاروائی سے انکار کر دیا۔ مولانا ارتضا صاحب نے اپنے ایک اخباری بیان میں جواب آں غزل کے طور پر جب پرنسپل صاحب کو مسلم لیگی ثابت کر دیا تو بہار اسمبلی میں ہنگامہ مچ گیا۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل صاحب اور ڈاکٹر سید محمد اقبال صاحب جیسے بزرگوں کے ایک وفد نے بھی اس ہنگامہ کو فرو کرانا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ مولانا ارتضا صاحب نے بعض خطوط اور اخباری تراشے پرنسپل صاحب کے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو کراچی بھی بھیج دیا تھا۔ عجب اتفاق کہ انہی دنوں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کسی نجی ضرورت کے تحت وطن تشریف لائے تو پرنسپل مدرسہ نے پٹنہ جنکشن پر اپنے استاد سے ملاقات کی اس ملاقات میں استاد نے شاگرد کی اچھی خبر لی اور ان ہنگاموں کو جلد فرو کرنے کی تلقین کی۔

مزاج کی اس سیمابیت و انقلابیت نے مولانا کو کبھی نچلا بیٹھنے نہیں دیا۔ ہر طرح کی

اہم شخصیات سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا معاملہ ہو یا مختلف النوع مگر اہم تصانیف سے اخذ ومطالعہ، چنانچہ قرآنی تحریک اور ماہنامہ ترجمان القرآن حیدرآباد کے بانی مولانا محمد مصلح صاحب سہسرامی جسے بعد میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے خرید لیا اور جو حیدر آباد سے دہلی ہوتا ہوا لاہور سے آج تک نکل رہا ہے۔ مولانا مصلح صاحب جب بھی اپنے وطن آتے مساجد میں مفت قرآنی تدریس کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ ارتضا صاحب نے طالب علمی ہی کے زمانے میں مولانا مصلح صاحب سے بھی استفادہ کیا۔ رجال سہسرام میں ان پر ایک تفصیلی تحقیقی مقالہ بھی قلم بند کیا۔ ان کے علاوہ سہسرام پٹنہ اور بہار کے مختلف علماء خانقاہوں کے صوفیا اور دانشوروں سے بھی اخذ واستفادہ کرنے میں جھجکتے نہیں تھے۔ اکثر کسی تحریکی پروگرام کے تحت رانچی آتے تو بالالتزام دو چار روز کا وقت فارغ کر کے غریب خانہ پر قیام کرتے تاکہ خاکسار کی ذاتی لائبریری سے تازہ ترین کتابوں کو دیکھنے کا موقع ملے۔ ان کا قلندرانہ انداز بڑا دلکش تھا۔ ناشتہ چائے کے بعد پان اپنی جیب سے پیسے دیکر منگوانے کی کوشش کرتے، اسرار کرنے پر پیسے واپس لیتے۔ پان کی گلوریاں منہ میں دبا کر اگلدان منگواتے اور پلتھی مار کے (دوزانو) بیٹھ جاتے اور فرماتے ''ہاں سجاد! یہ بتاؤ پچھلے تین ماہ کے عرصے میں فلاں فلاں موضوعات پر تمہاری لائبریری میں کیا کیا اضافہ ہوا ہے؟'' میں کتابیں نکال نکال کے ان کے سامنے ڈھیر کرتا رہتا اور وہ موضوع وار ان کے تھاک لگا لگا کر اپنے بستر کے ایک کنارے پر رکھتے جاتے یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کے بعد قیلولہ کے وقت بھی لیٹے لیٹے پڑھتے رہتے۔ شب و روز والی ڈائری ان کے پاس ہمیشہ رہتی چنانچہ مطالعہ کے دوران، بیچ بیچ میں کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے تھے۔ عمر میں جونیئر احباب و رفقا کو ہمیشہ ''تم'' سے خطاب کرتے۔ پروفیسر عبدالمغنی مرحوم اور ہم سب لوگ مولانا کے اس ''تم'' میں ''آپ'' سے بڑھ کر جو خلوص اور اپنائیت کی چاشنی تھی اس سے

ہمیشہ لطف اندوز ہوتے۔

مولانا مثبت عملی اقدامات اور علمی موضوعات کی ہمیشہ قدر افزائی کرتے۔۱۹۶۰ء کی دہائی میں میں نے تین موضوعات پر تحقیقی مواد اکٹھا کرنے کا آغاز کیا۔(1) تاریخ تحریک اسلامی حلقہ بہار (2) سوانح عمری مولانا انیس الدین احمد سابق امیر حلقہ بہار اور (3) آدیباسی تہذیب وثقافت (دعوتی نقطہ نظر سے) تو ان موضوعات کی مولانا نے تحسین و ستائش کی اور حوصلہ بڑھاتے رہے۔پھر کچھ عرصہ کے بعد مشورتاً میں نے جماعت کی مرکزی اور ریاستی قیادت کو بھی ان موضوعات کی طرف متوجہ کیا۔حلقہ بہار کی شوریٰ میں برسوں کے بعد جب ان موضوعات کو رکھا گیا تو مولانا نے ہر طرح کی تائید کی۔تحقیق وترتیب کے لئے ایک سہ نفری کمیٹی تشکیل دی گئی۔جس میں مولانا کے علاوہ عبدالباری صاحب مرحوم اور یہ خاکسار بھی تھا۔میں نے جمع شدہ مواد اس کمیٹی کے سپرد کردی، چنانچہ عبدالباری صاحب حسب موقع، موئی بنی سے رانچی غریب خانہ پر وقفہ وقفہ سے ہفتہ عشرہ کے لئے آتے رہے۔ رانچی یونیورسٹی اور قبائلی سرکاری تحقیقی ادارے کے ڈائریکٹران اور ذمہ داروں سے راقم نے ان کا تعارف کرادیا تھا اس لئے مطالعہ وتحقیق کی سب نے خوشدلی سے اجازت دیدی تھی، جو مسودات تیار ہوتے تھے ہم تینوں ساتھ بیٹھ کے ان پر نظر ثانی کرتے۔چنانچہ آدیباسی تہذیب وثقافت ''والی کتاب مرکزی مکتبہ سے برسوں قبل شائع ہوگئی البتہ ''انیس الدین احمد صاحب'' کی سوانح عمری بعض اسباب کی بناپر شائع نہ ہوسکی۔تاریخ تحریک بہار، پر کام آگے نہ بڑھ سکا۔مسودات پر نظر ثانی کے دوران اندازہ ہوا کہ علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہونے اور عربی فارسی اردو کی مستحکم بنیادی تعلیم اور وسیع المطالعہ ہونے کے سبب ادب و انشا اور لسانیات ولفظیات پر بھی مولانا کو ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی چرکنڈہ، دھنباد کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کی

حیثیت سے بحالی ہوگئی۔مگر 1959ء میں وہاں سے مستعفی ہوگئے۔مولانا افضل حسین صاحب پرنسپل اورناظم درسگاہ اسلامی رامپور کی تحریک پر وہاں مدرس کی حیثیت سے طلب کئے گئے،اس دوران رکن جماعت اسلامی بھی ہوگئے۔مگر دو معاملات میں درسگاہ کی انتظامیہ سے مولانا کا سخت اختلاف ہوگیا اولاً یہ کہ تدریس کے علاوہ درسگاہ کے دیگر انتظامی مسائل میں کاموں کے انبار کے سبب انہیں مطالعہ اور دعوتی کام کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔دوم یہ کہ ان سے تعلیم وسند اور عمر و تجربے میں کمی کے باوجود ایک نئے معلم کی تنخواہ کا اسکیل مولانا کی تنخواہ سے زیادہ مقرر کیا گیا جس پر انہیں سخت ردعمل ہوا،اپنے ایک شعر میں اس ردعمل کا اظہار اس طرح کیا۔

قدرت نے کیا تھا مجھے آزاد ہی پیدا
وہ مرغ تہہ دام ہے معلوم نہیں کیوں؟

اور 9 مہینے کے بعد ہی وہ مرغ مستعفی ہو کے آزاد ہوگیا۔امیر حلقہ بہار انیس الدین احمد صاحب مرحوم کے مشورے پر مولانا کچھ دنوں تک درسگاہ اسلامی صادق پور، پٹنہ میں بھی مدرس رہے مگر وہاں سے جلد ہی درسگاہ اسلامی جموئی کے صدر مدرس بنا کے بھیجدیئے گئے جس کی تعمیر و ترقی میں مولانا نے بھرپور حصہ لیا۔جموئی سے قریب شیخ پورہ کے مدرسے میں مولانا کے والد بزرگوار بھی ایک عرصہ تک مدرس تھے۔جموئی ہی میں آپ کی ملاقات انگریزی اور اردو کے نامور صحافی آصف عمر صاحب سے ہوئی جہاں ان کے والد پولس محکمے میں ملازمت کرتے تھے۔آصف عمر صاحب اس وقت نوعمر طالب علم تھے مگر مولانا کی قربت نے ان کے ذوق علم وادب اور دعوت وتحریک کو نکھارنے میں کلیدی رول ادا کیا۔عمر کے آخری دور تک جماعت اسلامی پٹنہ کمشنری کی نظامت برسوں مولانا کے ذمہ رہی چنانچہ اس علاقے کی کئی اہم تحریکی شخصیتوں کی تعمیر وتشکیل میں مولانا ارتضا صاحب کے اثرات کو تسلیم

کیا جاتا ہے۔محمد ارادت کریم،محمد نعمان، بہار شریف، حافظ امان اللہ خان نوادہ، شبیر عالم خاں، مولانا طارق احسن فلاحی، محمد الیاس گیا، مولانا محمد ابرار الحق شمسی اورنگ آباد، بدر الدین خان جپلا، بطور خاص ہیں۔ڈاکٹر ظفر امام سہسرامی، ماسٹر سرور عالم سہسرامی، مولانا ڈاکٹر مظفر حسن عالی، پی،ایچ،ڈی (جنہوں نے بعد میں خاکسار کی زیر نگرانی ''مولانا حاذق ضیائی سہسرامی، حیات وخدمات'' کے زیر عنوان رانچی یونیورسٹی سے ڈی،لٹ کی ڈگری حاصل کی) برسوں سیتامڑھی کے ایک گورنمنٹ کالج میں اردو کے استاذ رہے۔ان کے علاوہ قمر الدین خان محمد غیاث انصاری، ڈہری آن سون، جو مولانا کے ریٹائرمنٹ (31 جولائی 94ء کے بعد، پٹنہ کمشنری کی نظامت کی ذمہ داریاں سنبھال رہے تھے۔ پروفیسر سید محمد اقبال مرحوم پروفیسر بدیع الزماں اور علاقہ بھر کے بہت سے لوگوں کی دینی وعلمی اور دعوتی وتحریکی تربیت میں مولانا کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

فارغ اوقات میں اکثر مولانا سرگزشت حیات کے بہت سے واقعات مزے لے لے کر سناتے رہتے۔ 1947 کے حصول آزادی تک ملک گیر پیمانے پر بہار اور سہسرام میں بھی کانگریس مسلم لیگ اور مومن کانفرنس کے حوالے سے گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، مسٹر جناح، عاصم بہاری اور عبد القیوم انصاری وغیرہ کے ناموں کا اچھا خاصا غلغلہ تھا۔ ہر جگہ مسلمان بھی دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ والے اپنے سیاسی مخالفوں کو کافر تک کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔اس ماحول میں بقول مولانا موصوف

> ''معلوم نہیں کس نے مجھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب'' مسلمان اور سیاسی کشمکش'' دیدی جس سے یہ واضح ہوگیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا موقف غلط ہے۔اس کتاب اور ترجمان القرآن کے مطالعہ سے پہلے ماہنامہ نگار اور نیاز فتحپوری کا شیدائی تھا لیکن تنقیحات،

تفہیمات اور "تجدد کا پائے چوبیں" پڑھ کے نیاز فتحپوری کا بھرم جاتا رہا۔
رکنیت کے دو سال بعد 1961 میں ناظم کمشنری پٹنہ بنا دیا۔ گیا شہر کی ایک
خالی دوکان کو دفتر جماعت بنایا تو شہر کے کچھ شر پسند نوجوانوں کو بعض
مخالفین نے جماعت کے خلاف ورغلایا تو وہ لوگ بپھرے ہوئے ان کے
پاس آئے مگر نصف گھنٹے کی گفتگو کے بعد ٹھنڈے ہو کر واپس چلے گئے۔
اس کسمپرسی کے عالم میں گیا شہر میں کمشنری کے اجتماع عام کا اعلان کر دیا
گیا۔ گھر پہنچ کے بیمار ہو گیا تو بعض رفقا نے پریشان ہو ہو کر اطلاع دی کہ
اسکول والوں نے جگہ دینے سے انکار کر دیا ہے اور اجتماع کا چندہ صرف
45 روپے ہوئے ہیں۔ ادھر آپ بھی بیمار ہیں لہٰذا پروگرام ملتوی کر دیا
جائے"۔

"میں نے سختی سے انکار کیا اور کہلا بھیجا کہ میرے قائم مقام عبدالباری
صاحب پہنچ رہے ہیں، اسکول میں جگہ نہیں ملے گی تو جلسہ فٹ پاتھ پر ہوگا
مگر ملتوی نہیں ہوگا"۔

ایسے وقت میں جبکہ گیا میں جماعت کے لئے حالات نہایت سخت تھے، خدا بھلا
کرے ڈاکٹر محمد مطیع اللہ صاحب کا جنہوں نے اپنی ڈسپنسری کا بالائی کمرہ دفتر جماعت کو
کرایہ پر دینا منظور کر لیا۔ پھر ہم لوگوں نے امیر حلقہ بہار انیس الدین احمد صاحب کو راضی کیا
کہ بہار کا دفتر حلقہ چترپور رام گڑھ سے پٹنہ منتقل کیا جائے چنانچہ وہ دفتر سعید منزل، سلطان
گنج، پٹنہ میں منتقل ہو گیا۔ جہاں امیر حلقہ مع متعلقین آ گئے۔ حلقہ بہار کا دفتر چھٹی دہائی کے
اوائل تک محض دو افراد پر مشتمل تھا اولاً امیر حلقہ بہار انیس الدین احمد صاحب اور دوم ان
کے آفس سکریٹری عبدالودود صاحب، جو راقم الحروف کے ہم وطن، پڑوسی اور لنگوٹیا یار تھے۔

امیر حلقہ نے انہیں بہار شریف کے ایک بیڑی گدام کی منشی سے استعفیٰ دلوا کے دفتر حلقہ پٹنہ میں اپنا آفس سکریٹری بنالیا۔عبدالودود صاحب نے بھی تاحیات اس ذمہ داری کو نباہ کے دکھادیا۔

راقم السطور پٹنہ کالج اور یونیورسٹی کا ۱۹۵۵تا۱۹۵۹ طالب علم تھا۔اس دوران بابائے تحریک اسلامی بہار،ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے جامعہ ملیہ کے شاگرد، اور جماعت اسلامی ہند کے اساسی رکن حسنین سید صاحب،مولانا محمد سلمان صاحب بعدہٗ مدیر دعوت وعربی البعث اسلامی، دہلی، ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب امیر مقامی پٹنہ اور دیگر اکابرین جماعت سے مخلصانہ رابطے کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔اسی ضمن میں تحریک اسلامی بہار کی اگلی جونئر کڑی میں مولانا ارتضاء صاحب کا شمار تھا۔اس لئے ان سے رابطہ فطری انداز میں مرحلہ بمرحلہ بڑھتا رہا۔طلبا اور اساتذہ کے درمیان منظم انداز میں تحریکی کام کا آغاز ابھی باقی تھا،اس خاکسار کے علاوہ پٹنہ یونیورسٹی کے ہمارے ساتھی ڈاکٹر مقصود عالم صدیقی صاحب انفرادی طور پر اندنوں یونیورسٹی کیمپس میں متحرک تھے۔سینئر ارکان جماعت کے مقابلے میں مولانا ارتضا اور اظہار کریم صاحب بھاگلپوری چونکہ عمر میں ہم سے نسبتاً قریب تھے اس لئے ان سے کھل کے ہر طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوتی۔تقسیم ملک کے تازہ زخم اور ملک بھر کے سخت ترین حالات کی بنا پر بعض علاقوں کے فعال تحریکی افراد بھی خاموش اور گوشہ گمنامی میں جا پڑے تھے پٹنہ میں خبر ملی کہ بہار شریف میں اصغر مجیبی صاحب (بھانجے مہدی حسن صاحب وکیل) محلہ گڑھ زندالندہ کالج، پرانے رکن جماعت ہیں اور ان کے پاس کتابوں کا بھی ایک اچھا ذخیرہ ہے۔چنانچہ تحریکی تناظر میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ عمدہ فرنیچر تیار کرنے والے بڑے تاجر اور زمیندار کے اندر ایک بڑا انقلابی چھپا ہوا ہے۔راقم الحروف نے عبدالودود صاحب اور محمد نعیم الدین صاحب وغیرہم کے

تعاون سے بہار شریف میں نوجوانوں کی ایک ٹیم بنائی تو اصغر مجیبی صاحب اور مولانا تصدق حسین صاحب (امام جامع مسجد بہار شریف) ضعیف العمری اور گھٹنوں کے درد کے باوجود نئے سرے سے متحرک وفعال ہو گئے۔ گرد آلود لائبریری کو جھاڑ پونچھ کے از سر نو تازہ کیا گیا اور پورے شہر میں مختلف طرح کے پروگراموں کے انعقاد کا سلسلہ چل پڑا۔ مذکورہ بالا سینئر اور جونیر اکابرین تحریک کے پروگراموں اور حوصلہ افزائیوں نے بہار شریف کو اپنے حدود میں دوبارہ کھڑا کر دیا۔

ایمرجنسی سے بھی پہلے جس اسلامک ایجوکیشن بورڈ، بہار (جھارکھنڈ) کا رانچی سے آغاز کار کیا گیا تھا۔ اس مینی یونیورسٹی کے تخیل وتصور سے مولانا ارتضا صاحب خاصے مسرور ہوئے اور آخر وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہے۔ اسی طرح ادارہ ادب اسلامی ہند کا آٹھویں کی دہائی میں تقریباً دس برس تک خاکسار کو صدر ادارہ بنا کر از سر نو منظم ومتحرک کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تو بنگال تا دہلی اور پنجاب تا کیرالہ نیز بہار کے طول وعرض میں دوروں اور پروگراموں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ اس موقع پر بھی مولانا ارتضا صاحب بالخصوص بہار میں زبان وقلم سے اس ادبی تحریک کے موثر معاون بنے رہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بالخصوص شمال مشرقی ہند میں آزادی کے بیسویں برس قبل وقفہ وقفہ سے جاری تھا مگر آزادی کے بعد تو ایسا لگا کہ جیسے فرقہ پرستوں اور قاتلوں کو قتل و غارت گری ہی کے لئے آزادی ملی ہے۔ خاص طور پر ۱۹۶۴ء کا فرقہ وارانہ فساد آزاد ہندوستان کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اور وسیع الاطراف فساد تھا جو 350 کیلومیٹر کی وسعت میں پھیلا ہوا تھا جس سے بنگال، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش بری طرح متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں مولانا ارتضا صاحب کو کولکتہ (کلکتہ) راؤرکیلا اور جمشید پور کے انتہائی خوفناک ماحول میں ریلیف کے کاموں کے لئے انیس الدین احمد صاحب نے طلب

کیااور سیالدہ کے بجائے ہوڑہ سے آنے کی تاکید کی۔حالات کی خوفناکی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کی والدہ محترمہ کو ریلیف کے کاموں کے لئے ان کی طلبی کی خبر ملی تو وہ بے ہوش ہوگئیں اور بڑی مشکل سے دل پر پتھر رکھ کر انہیں جانے کی اجازت دی۔کلکتہ کے مسلم ہوسٹلوں میں آگ لگادی گئی تھی اور مسلم طلباء بڑی بے پناہی کے عالم میں تھے کہ دو مہینے کے بعد یونیورسٹی کے فائنل امتحانات ہونے والے تھے۔مجھے طلباء کے درمیان ریلیف کے کاموں کے لئے طلب کیا گیا اندنوں میں بھاگلپور میں تھا وہیں سے کلکتہ کا رخ کیا تو ڈاکٹر مظفر اقبال صاحب صدر شعبہ اردو نے برجستہ کہا کہ

"اندنوں مسلمان کلکتہ سے جوق در جوق واپس آرہے ہیں اور آپ الٹی سمت کلکتہ جارہے ہیں مگر ایک نیک کام میں جارہے ہیں۔اس لئے جایئے اللہ آپ کا حافظ ونگہبان ہو"

شہر کلکتہ کا یہ حال تھا کہ بعض بڑے بڑے مسلم علاقے قتل وغارت گری،لوٹ اور آتش زنی سے کھنڈر ہورہے تھے۔کروڑ پتی کاروباری فٹ پاتھ پر آگئے تھے اور دانے دانے کو محتاج ہوگئے تھے۔پولس اور انتظامیہ سمیت،غارت گروں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔جماعت کے ریلیف ورکر مظلوموں کی مدد کے لئے ضروری ساز وسامان لے کر نکلتے مگر بعض علاقوں میں فرقہ پرست انہیں پکڑ کے مقامی تھانے میں پاکستانی قرار دیکر لے جاتے اور وہاں سے وہ جیل بھیج دیئے جاتے تھے۔ریلیف کی ٹیم نے کئی وکلا متعین کررکھے تھے جو ہر گرفتار شدہ کی ضمانت کے لئے فی الفور کاروائی پر مامور تھے۔حد تو یہ ہوگئی کہ محمد شفیع مونس صاحب اور انیس الدین احمد صاحب ذمہ داران ریلیف کو ایک روز چند پولس افسران نے کورز مغربی بنگال (پی،سی،سین کانگریس) کا حوالہ دیکر بنگال سے نکل جانے کا ہٹلری حکم دیا اور انہیں بذریعہ ٹرین ریاست بدر کردیا گیا۔تب امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث

اصلاحی ندوی صاحب ڈاکٹر سید محمود صاحب کے ساتھ کلکتہ ملا جان محمد صاحب (صدر خلافت کمیٹی) کے یہاں تشریف لائے تو بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ مولانا ارتضا صاحب بھی وہاں موجود تھے ان کا بیان ہے کہ ڈاکٹر سید محمود صاحب نے دوران گفتگو سب کے سامنے کہا کہ ''جس ملت کو مولانا ابو اللیث کا دماغ، ملا جان محمد کی جرأت اور سید بدر الدجی کی حمیت حاصل ہو تو کوئی اس ملت کو مٹا نہیں سکتا'' ڈاکٹر سید محمود اپنی عمر اور صحت کے اعتبار سے بالکل معذور ہو چکے تھے پھر بھی ملی درد اور امیر جماعت کی گزارش پر صعوبت سفر برداشت کی۔

چاروں بزرگوں کا وفد گورنر بنگال سے مل کے جب یہ شکایت کی کہ ایک تو اس بے دردی سے مسلمانوں کو بنگال میں تباہ و برباد کیا گیا اور اس پر جماعت اسلامی کے دو ذمہ داروں کو مظلوموں کی خدمت سے محروم کر کے آپ کے حکم سے ریاست بدر کر دیا'' اس پر گورنر نے اپنے حکم سے انکار کیا اور کہا کہ اگر ایسی نا اہلی ہوئی تو انہیں واپس بلایا جائے۔ چنانچہ دونوں حضرات پھر تشریف لائے مگر اس وقت اس جان لیوا فساد کی آگ بنگال سے آگے بڑھ کے راؤرکیلا اور مدھیہ پردیش کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ حالات ایسے نازک اور سنگین تھے کہ بنگال سے کسی مسلم ریلیف ورکر کا سفر بھی ناممکن ہو گیا تھا چنانچہ عبد الفتاح صاحب اور اظہار کریم صاحب پہلے کلکتہ سے پٹنہ گئے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز راوڑ کیلا پہنچے اور خدا خدا کر کے ریلیف کا آغاز کیا گیا۔

اس ظلم و ستم کے خلاف ملا جان محمد صاحب نے اواخر رمضان میں اعلان کر دیا کہ اس سال مسلمانان کلکتہ منومنٹ کے میدان میں احتجاجاً نماز عید ادا نہیں کریں گے۔ جس سے بنگال کی کانگریسی سرکار میں کھلبلی مچ گئی۔ وزیر اعلیٰ پی سی سین نے ملا جان محمد صاحب کی خوشامد برآمد شروع کی کہ ایسا نہ کریں آخر حکومت کے بہت اصرار پر ملا صاحب نے اجازت

دیدی مگر کل تین صف نمازی تھے۔خطبہ ونماز کے بعد وزیر اعلیٰ نے بھی مسلمانوں کے سامنے تقریر کی اور پریس کی تصاویر سے ایسی رپورٹنگ کی گئی جیسے مسلمانوں کے ساتھ بنگال میں کوئی حادثہ ہوا ہی نہ ہو۔

مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب سے روزنامہ آبشار کے مشہور اردو صحافی محمد ابراہیم ہوش نے مولانا ارتضا صاحب کے سامنے کلکتہ میں ۱۹۵۱ء کے فسادات کا واقعہ بتاتے ہوئے بیان کیا کہ فون سے جب وزیر تعلیم حکومت ہند مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو اس سانحہ کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے بڑی بیچارگی سے یہ فرمایا کہ: ”حکومت کی نبض پر میرا ہاتھ ہے میں اس کی ہر دھڑکن محسوس کرتا ہوں مگر کچھ نہیں کر سکتا“ اس دوسرے فساد ۱۹۶۴ء میں مولانا آزاد تو نہ تھے مگر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ضرور تھے۔

مولانا اپنے اساتذہ اور مربیوں میں مولانا سید احمد عروج قادری صاحب کا بطور خاص تذکرہ کرتے تھے، ان کے بقول مولانا قادری صاحب کی خاندانی نسبت سید عبد القادر جیلانیؒ سے تھی۔موصوف ۱۹۴۰ء میں مدرسہ خانقاہ کبیریہ میں مدرس کی حیثیت سے جوائن کیا تو ان سے اردو اور عربی پڑھنے کا انہیں موقع ملا۔استاد محترم کی ہمت افزائی کی بنا پر مدرسہ کے ایک جلسہ میں نعت خوانی بھی کی۔اس مدرسہ کے بعد مولانا عروج قادری صاحب نے مدرسہ عزیزیہ بہار شریف جوائن کیا، پھر وہاں سے مدرسہ شمس الہدیٰ آئے جہاں کبھی ان کے والد بزرگوار بھی استاد تھے۔مگر وہاں کی ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آ کے مستعفی ہو گئے تو جماعت نے انہیں رامپور کے ماہنامہ زندگی کی ادارت سپرد کی۔جہاں آخر عمر تک رہے۔۱۷ مئی ۱۹۸۶ء کو موصوف کا انتقال ہو گیا۔

مولانا ارتضا صاحب نے ان بزرگوں کے علاوہ سہسرام سے پٹنہ تک متعدد دیگر اساتذہ کرام اور اہم شخصیات سے بھرپور طریقے سے استفادہ کیا۔سہسرامی شخصیات کا تفصیلی

تذکرہ ان کی مشہور کتاب ''رجال سہسرام'' میں درج ہے۔ان شخصیات کے علاوہ سہسرام کا علمی ادبی، دینی، سماجی اور سیاسی پس منظر بھی اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ تقسیم ملک سے قبل تک دینی مدارس، ادبی مجلسوں میں ہفتہ وار اور ماہوار طرحی اور غیر طرحی مشاعروں اور مشاہیر شعراء وادباء کے جم گھٹ نے سہسرام کی فضا کو معطر کر رکھا تھا۔مولانا شاہ غلام مخدوم مست سہسرامی، معروف قادرالکلام شاعر تھے جن کی نظم ''چائے نامے'' کی تحسین ان کے عہد جوانی میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے بھی کی تھی سب سے پہلے اصلاح سخن ارتضا صاحب نے انہی سے ۱۹۴۲ء میں لی۔ان کی دی ہوئی ایک طرح پر غزل بھی کہی تھی۔ وہ طرح یہ تھی۔ ع آج مرجھائے گلے کا ہار کیوں؟

مولانا ارتضا حاذق ضیائی صاحب نے اس طرح پر گرہ لگائی:

یوں گلے کس نے لگایا ہار کیوں

آج مرجھائے گلے کا ہار کیوں؟

مولانا موصوف کے روابط سہسرام کی تقریباً تمام اہم علمی وادبی شخصیات سے تھے۔اس ربط کے مثبت اور منفی دونوں پہلو تھے بعض شخصیات ان کی تحریکی دلچسپیوں کے کٹر مخالف انہیں دائرہ اسلام سے خارج تک کرنے اور انہیں جیل بھجوانے پر تلی ہوئی تھیں لیکن بیشتر ان کی علمی، تحقیقی، شعری ونثری صلاحیتوں کے معترف اور قدرداں تھے۔ایسی شخصیات میں بطور خاص الیاس سہسرامی، محمود سہسرامی، سائل سہسرامی، قمر گیاوی، افسر سہسرامی، مہجور سہسرامی، نیز پروفیسر عبدالمغنی، غلام سرور اور شاہد رام نگری وغیرہ معروف ہیں۔

معاصرین کے علاوہ مولانا نے اسلام کی تاریخی شخصیات میں مولانا رومی، ابن سینا، ابن العربی، جمال الدین افغانی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے بطور خاص تاثرات قبول کئے۔مغربی شخصیات میں ترجمے کے ذریعہ مارکس، لینن برنارڈ شا وغیرہ کے افکار سے بھی

استفادہ کیا۔مگر موصوف اسلامی نظریہ زندگی اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو کامل واکمل سمجھ کے قیامت تک انسانیت کی نجات انہی کی پیروی پر منحصر سمجھتے تھے۔شعر سے زیادہ انہیں نثر اور علمی وادبی تحقیق سے بڑی دلچسپی تھی۔قادرالکلامی کا یہ حال تھا کہ ''وفیات'' اور دیگر تاریخی مواقع کو فی الفور شعری جامہ پہنانے کی پوری قدرت رکھتے تھے۔مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بڑے شوق سے شرکت کرتے مگر اپنے اشعار سنانے میں انہیں تکلف محسوس ہوتا تھا پھر بھی ہم بے تکلف احباب کبھی کبھی انہیں اکساتے اور وہ موڈ میں آتے تو چیدہ چیدہ کچھ اشعار سناتے۔ان کا یہ نعتیہ شعر ہے

دیا ہے درس جس نے ایک عالم کو محبت کا　　بہر صورت ہمیں دامن اسی کا تھام لینا ہے

موصوف اخلاقی وروحانی قدروں کے بغیر ہر طرح کے علم وفن کے منکر وناقد تھے۔

ہے عقل فتنہ خیز تو ہے علم فتنہ خیز　　دشمن ہے اپنی راہ کا یہ آدمی ابھی

اپنی آنکھوں نے بہت دیکھے مناظر لفریب
زندگی کی صبح ہو یا زندگی کی شام ہو

اپنے معاصر اور بزرگ شعرا میں انہیں الطاف حسین مانوس سہسرامی سے بطور خاص لگاؤ تھا انکے کئی مجموعوں کی اشاعت میں مولانا ارتضا صاحب کی کاوشوں کا بطور خاص دخل ہے۔ڈاکٹر خالد سجاد نے مانوس سہسرامی (پیدائش 13 جنوری 1913ء وفات جنوری 1982) کو جب اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تو بہت خوش ہوئے اور ہر طرح کے تعاون کی پیشکش کی۔والدین کی بے وقت موت نے مانوس کی زندگی کو مصائب وآلام سے بھر دیا تھا مگر ان کے ذوق مطالعہ اور تخلیقی صلاحیت نے مشاہیر ادب سے بھی اپنی المیہ نگاری کا لوہا منوایا۔ان کے استاد عشرت لکھنوی نے تو ان کی عہد جوانی میں ان کی شعری صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔

؎ لطف کیوں حاصل نہ ہو مانوس کے اشعار میں
شاعری میں اس کو فیض روحِ پاکِ میر ہے

اور اپنے خط میں انہیں لکھا کہ

"تم اب تک زندہ کیسے ہو، ایسے شعر کہنے والے کا تو کلیجہ پھٹ جانا چاہئے"

مصائب و افلاس کے باوجود مانوس کا عزم دیکھئے۔

ع جیسی بھی مصیبت آیا کی، ہر حال میں استقبال کیا

مشہور محقق و ناقد پروفیسر اختر اورینوی نے مانوس کے فن سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ

"شاد اور یاس یگانہ عظیم آبادی کے بعد بہار نے جدید غزل نگاری کا ایک اور چشم و چراغ پیدا کیا..... یعنی مانوس سہسرامی" (بحوالہ تنقید جدید)

مانوس کے اس طرح کے اشعار جو مولانا کو بہت عزیز تھے۔

؎ کوئی نہیں، نہیں سہی شکوہ روزگار کیا
ہے جو انیس غم ابھی اس کا بھی اعتبار کیا

؎ شکوۂ زندگی غلط، دل کی امید بھی غلط
میں ہی نہیں نظر میں جب، پرسش حال زار کیا

؎ کوئی اس کے دل سے بھی پوچھتا، کبھی عمر بھر جو ہنسا نہیں
جسے اب تو وہم یہ ہو چلا کہ میرا کوئی خدا نہیں

؎ کوئی زندگی ہے یہ زندگی کہ خوشی میں غم کا مزا ملے
میری سرگزشت نہ پوچھئے کبھی کامیاب ہوا نہیں

مگر مانوس کی بلند خیالی، تازہ کاری اور پاکیزگی افکار کا بھی جواب نہیں۔

؎ کٹھن یہ جتنی بھی زندگی ہو یقین رکھیے بسر بھی ہوگی

اگر پریشان کن یہ شب ہے، تو روح پر در سحر بھی ہوگی۔

؎ ابھی تو مانوس کو بیم نامرادی کا سامنا ہے

اسی خرابے میں کیا عجب ہے سراغ مل جائے روشنی کا

اس ادبی اور شاعرانہ ماحول میں مولانا ارتضا صاحب نے غزل نظم تاریخ گوئی ،قطعہ، رباعی وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی کئی مجموعے بھی شائع ہوئے۔ان کی شاعری میں، روایتی عشق وعاشقی اور ابتذال وہرزہ سرائی نام کو نہیں۔کلام میں سادگی، ومتانت اور بلند خیالی ہر جگہ پائی جاتی ہے وہ حالی واقبال سے متاثر ضرور تھے۔ان کی طرح رفعت خیال اور معنوی وتہداری مولانا کے یہاں تو نہیں مگر "میری" انداز میں انکا منفرد تحریکی رنگ وآہنگ ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔غزلوں میں تکرار وانتشار کے بجائے ربط و تسلسل اور خاندانی درویشانہ وصوفیانہ کیفیت واضح ہے۔سہرام کی ادبی فضا پر اس زمانے میں ترقی پسندی سے زیادہ کلاسیکی انداز کی واقعیت وحقیقت پسندی کا گہرا اثر تھا۔سہرامی شعرا میں کیف سہرامی کے یہاں وارفتگی و رومانیت پائی جاتی ہے تو ناظم کے یہاں رجائیت،کلیم سہرامی کے یہاں نیرنگی"۔حاذق ضیائی سہرامی" کے یہاں حقیقت وواقعیت نگاری کا رنگ واضح انداز میں دیکھنا ہوتو بعض شعرا سے ان کا تقابلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، ڈاکٹر مظفر حسن عالی نے اپنے تحقیقی مطالعہ میں جا بجا اس کا اہتمام اچھا خاصا کیا ہے ۔یہاں ہم بہار کے نمائندہ اور معروف ترین شاعر علامہ جمیل مظہری کی ایک زمین میں ان کی محض انفرادیت کی وضاحت کے لئے چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

جمیل مظہری

؎ بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ے ہے روح تاریکیوں میں حیران بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

ارتضاء الدین ے

برت رہا ہوں زندگی کو شعور رکھتا ہوں زندگی کا
متاع حسن سخن سے بالا خیال آیا ہے پھر کسی کا
کسی سے ڈرنا نہ خوف کھانا خدا کے آگے ہی سر جھکانا
زمام عالم کو تھام لینا، یہی تو ہے فرق آدمی کا

مولانا کے اشہب قلم کا اصل میدان نثر کا تھا چنانچہ ان کی متعدد کتابیں ان کی حیات میں اور ان کے انتقال کے بعد بھی شائع ہوئیں۔ ''رجال سہسرام'' کو مولانا نے بیسیوں، برس ایک تحقیقی پروجیکٹ کے طور پر مکمل کیا جس کو خدا بخش خاں پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ابھی بہت سے مقالے غیر شائع شدہ ہیں۔ ان کے سعادتمند صاحبزادے محمد ارتقاء الدین اور گیا کے ان کے بعض احباب ومتاثرین ان کی اشاعت کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ نثر میں موصوف علامہ شبلی سے متاثر اور معتقد معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ اور اسلامیات سے دونوں بزرگوں کی دلچسپی یکساں محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی منشاۃ ثانیہ کے دونوں عمر بھر خواہاں رہے۔ دونوں نے اپنی علمی زندگی کو ایک مثبت رخ دے رکھا تھا جس کے تحت دونوں زندگی کے آخری لمحات تک تگ ودو کرتے رہے۔ البتہ علامہ شبلی کی نثر میں جو تخلیقیت، بلاغت اور حسن وتاثر آفرینی ہے وہ مولانا ارتضا کے یہاں بوجوہ نہیں ہیں۔ پھر بھی تمام تر محرومیوں، کمیوں اور معذوریوں کے باوجود مولانا نے جس ہمہ جہتی ہمت وکاوش کے نتیجے میں دینی، سماجی، تاریخی، ادبی اور سماجی موضوعات میں یادگار تحریریں پیش کی ہیں اسکی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ اسی علمی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ میٹرک

سے لے کر ایم اے اور پی ایچ ڈی کے طلباء اور ریسرچ اسکالرز مولانا سے مختلف موضوعات پر اخذ واستفادہ کے لئے ان سے ملتے رہتے تھے۔ سہ روزہ دعوت دہلی نے اکابرین جماعت اسلامی کے ۴۔۱۶ اساطین سے مختلف اہم مسائل پر جو خصوصی شمارہ چند سال قبل شائع کیا اس میں ایک اہم شخصیت مولانا ارتضا صاحب کی بھی تھی۔ موصوف کی علمی وادبی خدمات پر ڈی لٹ کی ڈگری بھی ایک اسکالر نے حاصل کی۔ جس کی نگرانی کا فریضہ راقم الحروف کو ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا کی اعلیٰ ظرفی کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے اہم ملی وتحریکی مسائل میں ان سے واضح اختلاف اور بحث ومباحثہ کے باوجود انہوں نے ان اختلافات کو انہیں مسائل تک محدود رکھا کم ظرفوں کی طرح اسے تعلقات کے دوسرے دائروں تک کبھی آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ہم نے کتابوں میں پڑھا اور بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ کسی فرد یا افراد کا اخلاص وایثار کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ میں نے ذاتی اور راست مطالعہ ومشاہدہ کی بنیاد پر دو شخصیات کی بے پناہ قربانیوں کے ثمرات واثرات کو پھلتا پھولتا دیکھا ہے۔ ایک مولانا علی حسین عاصم بہاری، جن کے دادا سے لے کر اپنے پوتے یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے بعد تک ملک وملت کی قربان گاہ پر اپنی پانچ نسلوں کو بھینٹ چڑھا دیا دوسرے مولانا ارتضاء الدین حاذق ضیائی جنہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پچھلی صدی کی چوتھی دہائی سے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔

ع آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(مولانا کی پیدائش 24 نومبر 1929ء وفات 10 جنوری 2010)

ابوالمجاہد زاہدؔ۔ رنگ و نور کا شاعر

اگر غور کیجئے تو یہ پوری کائنات رنگ و نور سے معمور ہی نہیں، اسکی تخلیق کا ایک شاہکار بھی ہے جہاں نور و ظلمت اور حق و باطل کی باہمی کشمکش ایک ازلی و ابدی حقیقت بھی ہے۔ انسانی زندگی ازل ہی سے روشنی سے کسب فیض اور تاریکی سے گریز اختیار کرتی رہی ہے۔ بہت سے فلسفیوں اور روحانیوں کا خیال ہے کہ ارض و سما کا خالق بھی ایک نور ہی ہے۔ اللہ نور السموات والارض، الہامی صحیفوں کی بشارت یہ ہے کہ بہشتی زندگی کی سب سے بڑی نعمت دیدار نور الٰہی ہوگی۔

خالق حقیقی نے کونا کوں تخلیقات کے تین درجے یا تین قسمیں بنائی ہیں۔ مٹی، آگ اور نور، ارضی تخلیقات مٹی سے، جن آگ سے اور فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ایران کے زرتشت نے اپنے مذہب کی بنیاد انوار پرستی یا آتش پرستی پر قائم کی تھی۔ جس کی توسیع، روشنی کے نمائندے اہرمزا اور تاریکی کے اہرمن کی شکل میں ہوئی۔ آریائی اساطیر میں اگنی سورج اور اندر دیوتا کی پوجا، انوار پرستی ہی کے شاخسانے کہے جاتے ہیں بعض ماہرین کے خیال میں مشہور فرانسیسی فلسفی برگساں کا نظریہ تحرک، روح کائنات کو تحرک اور روشنی جیسی نسبتاً تیز مادی صورتوں میں پیش کرتا ہے واضح ہو کہ آنکھیں دو ہی حقیقتوں کا ادراک کرتی ہیں، روشنی اور تاریکی۔ ان میں سے روشنی حدود اور نقوش کو نمایاں کرتی ہے اور تاریکی حدوں کو مٹاتی نقوش کو مدھم کرتی اور زندگی کو ابدی نیند سلا دینے کی کوشش کرتی ہے اسی لیے یہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی مظہر ہے۔ جدید نفسیات نے انسان کے اندرون میں بہت گہرائی تک جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ روشنی اور تاریکی نے اس قدیمی تصادم کو آرکی ٹائپ کا نام دیا ہے جسے شاعر بسا اوقات اپنے اندرون میں غواصی کر کے اپنی تخلیق میں عجیب سی توانائی اور شدت کو منعکس کرتا ہے جس کے نتیجے میں کلام کی سچائی انوکھی تازگی

کے ساتھ منظر عام پر آتی ہے۔

ابوالمجاہد زاہد کے تا حال تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔کئی شعری و نثری مجموعے منتظر اشاعت ہیں۔ ''تگ و تاز''(۱۹۵۷) ''کھلتی کلیاں''(۱۹۵۷ اور ۱۹۶۰)ان کے عہد شباب کے ایسے مجموعے ہیں جن میں موضوع کی مناسبت سے رنگ و نور کے مقابلے میں حرکت و حرارت کا اثر غالب ہے۔کئی مجموعے منتظر اشاعت ہیں مگر آخری مطبوعہ مجموعہ ''ید بیضا''(۱۹۹۸)اسم با مسمّٰی ہے۔شاعر نے یہ نام مجموعہ کو پر معنی بنانے کے لیے تلمیحی انداز میں اوڑھنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اس مجموعہ کا قاری سرسری طور پر بھی نظر ڈالے تو حمد'نعت'منقبت'غزل اور نظم ہر جگہ شاعر کا تابناک نوری انداز بیان بڑے موثر انداز میں چھلکا پڑتا ہے۔مذکورہ اولین تین موضوعات (حمد'نعت'منقبت) کو شاعر نے '' حرف تابندہ'' کا عنوان دیا ہے'حمد و نعت کے منظوم فرق جلی کو بتانے کے بعد ''دعا''اس حصے کی پہلی نظم ہے جس میں شاعر نے خالق کائنات سے بڑی عاجزی کے ساتھ سہل ممتنع میں جو دعا کی ہے اس کے اولین تین اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

مرے فکر و احساس کو جگمگا دے ستاروں کو تابندگی دینے والے
مرے دل کو بھی نور ایماں سے بھر دے مہ و مہر کو روشنی دینے والے
مرا مقصد زندگی بھی حسیں ہو گل و غنچہ کو تازگی دینے والے

دوسری 'حمد' کے یہ اشعار بھی توجہ کش ہیں۔ ؎

دھوپ بھی اور چھاؤں بھی اے آدمی دیتا ہے کون؟
کیا کبھی سوچا کہ غم دیتا، خوشی دیتا ہے کون؟
جگنوؤں کو کون پہناتا ہے، نورانی لباس
سات رنگوں کی ''دھنک'' کو چوڑی دیتا ہے کون؟

یہ ستارے، یہ گل و لالہ، یہ چنچل تتلیاں
ان حسینوں کو ادائے دلبری دیتا ہے کون؟

دس بندوں کی ایک معنی خیز مگر حسین نظم کا عنوان "قل ھو اللہ" ہے جس کا آغاز بڑے ڈرامائی انداز میں کیا ہے کہ "فلک پر دمکنے والے شرارے اور پرنور پارے سو گئے ہیں اور شوخ تاروں سے لبوں کی مسکراہٹ کھو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ رات کے قدموں کی آہٹ بھی کھو گئی ہے" وغیرہ۔ اسی طرح نعتیہ نظموں مثلاً "رحمت اللعالمین اور پیغمبر اعظم" وغیرہ میں جن ترکیبوں اور استعاروں میں حضورؐ کی صفات کو بیان کیا ہے ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔ "اخوت کی شمعیں، ذروں کو رونق طور دینے والے۔ اندھیرے پہ بارش نور فضاؤں کو منور اور ہواؤں کو معطر کرنے والے کتاب مبین و منور، دین روشن، آئینہ حق، تجلی مجلی بدر الدجیٰ، شمس الضحیٰ" وغیرہ۔

ابو لمجاہد زاہد کی ایک شاہکار نعت کے چند اشعار کی یادتازہ کیے بغیر ان کی پرکیف نورانی شاعری کے فوراور ذوق وشوق سے پرلب ولہجہ کا واقعی اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ؎

جب حرا سے ہویدا ہوئی روشنی — تیرگی چیخ اٹھی، روشنی روشنی
تیرا منکر کہاں؟ تیرا مومن کہاں — تیرگی تیرگی، روشنی روشنی
تیرے صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ روشنی، روشنی، روشنی، روشنی
پیروان محمدؐ کی کیا بات ہے — زیست بھی روشنی، موت بھی روشنی

سوال یہ ہے کہ رنگ و نور سے یہ شرابور مگر پرکیف شاعری، تاریکی کی گھبراہٹ اس پر غالب آنے کا جوش و جذبہ جسمانی اعتبار سے بظاہر اس "مشت استخواں میں آیا کہاں سے"۔ اس کے لیے ان کی تعلیم وتربیت، ادبی ماحول، اور مقصد زندگی پر اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ موصوف مدرسۂ عالیہ (اورنٹل کالج) رامپور کے فاضل،

الہ آباد بورڈ کے عالم، جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب کامل، مدرسہ عالیہ کے ممتاز علما اور مصنفین کے شاگرد۔ ۱۹۴۲ء سے شاعری کا شوق ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کی شاگردی اختیار اور ۱۹۴۵ء میں فارغ الاصلاح کر دیے گئے۔ رامپور اور دہلی کی مختلف علمی و ادبی تنظیموں کے ذمہ دار اور معیاری رسائل و اخبارات کے مرتب و منیجر کی حیثیت سے برسہا برس کام کیا بالخصوص ''دبدبۂ سکندری'' (رامپور) ''نئی نسلیں'' اور ''برادری'' (لکھنؤ) ''مومن'' (بدایوں) ''اچھا ساتھی'' (بجنور) ''پیش رفت'' (دہلی) وغیرہ۔ مزید یہ کہ عمر کا بیشتر حصہ مشہور دینی درسگاہوں (مرکزی درسگاہ اسلامی اور جامعات الصالحات رامپور) میں اردو، عربی زبان و ادب اور حدیث و فقہ کی تعلیم و تدریس میں صرف ہوا۔ ملک کی معروف دینی تنظیم جماعت اسلامی کی تحریک اور ان دنوں اس کے شعبۂ تعلیمات سے وابستہ ہیں۔ غرض کم عمری سے ضعیف العمری تک پوری زندگی دین تحریک اور علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ یہ وابستگی آج کے بہت سے دینداروں کی طرح ''ملازمانہ'' نہیں بلکہ قلبی اور والہانہ وابستگی رہی۔ اس علم و فضل اور دعوتی و تحریکی زندگی نے سماجی زندگی کے تضادات سے انہیں فکری و عملی دونوں سطحوں پر نبرد آزما رکھا ''سر و ساماں'' کے پیش لفظ میں اختر الایمان نے ایک جگہ کہا ہے کہ:

> ''معاشرہ اور شاعر ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہی معاندانہ رویہ شعری تخلیقات کی بنیاد ہے۔''

شاعر کا قلمی نام 'ابوالمجاہد' ہی نہیں زاہدؔ بھی ہے۔ مگر زاہد خشک نہیں انہوں نے اپنے عنفوان شباب میں ملک کی آزادی کے داغ داغ اجالے کو دیکھا اور تقسیم ملک کی قہرمانیوں کے بعد آزاد ہندوستان میں سماجی، معاشی اور اخلاقی و انسانی اقدار کے بحران کا مشاہدہ کیا تو ان کے اندر کا ''زاہد اور علیؔ'' حالات سے کشمکش کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ؎

ہر حادثے نے مجھ کو دیا تازہ ولولہ　　میں جس قدر دبایا گیا اور ابھر گیا

اب اس نور و ظلمت کی کشمکش کے چند مناظر ملاحظہ ہوں: ؎

یہ دور شمس و قمر، یہ فروغ علم و ہنر　　زمین پھر بھی ترستی ہے روشنی کے لیے
کبھی اٹھے تھے جو خورشید زندگی بن کر　　ترس رہے ہیں وہ تاروں کی روشنی کے لیے
رہ حیات کی تاریکیوں میں اے زاہد　　چراغ دل ہے مرے پاس روشنی کے لیے

تحریکی زندگی نے تمام تر ذاتی و سماجی مصائب و آلام کے باوجود زاہد کو کبھی مایوس اور حراساں نہ ہونے دیا۔ بلکہ پرامید اور حوصلہ مند رکھا۔ ایک طرف "آفاق" کا یہ عالم ہے کہ ؎

وہاں یہ جشن بہاراں عجیب لگتا ہے　　جہاں جلائی گئیں بستیاں گلابوں کی

مگر "انفس" کے رجائی انداز کی ولولہ خیزی ملاحظہ ہو ؎

ہم اپنے ساتھ لائے ہیں انوار زندگی　　جب ہم نہ تھے، کہیں بھی نہ تھی زندگی حسیں
کہیں پناہ نہ پائے گی ظلمت دوراں　　زمیں پہ فصل اگے گی پھر آفتابوں کی

یہ حسن و زندگی کی رفیق کڑی مشقت کے بغیر ممکن نہیں شاعر کا تیور دیکھیے: ؎

ہم تو ٹھہرے دھوپ کے راہی　　ہاں! تم جاؤ سائے سائے

ظلمت شام، بلا سے کیا ڈریں اے دوستو
یہ تو صبح نو کے پرچم کے سوا کچھ بھی نہیں

جب دماغ اہل گلشن کے جلنے لگے　　لالہ و گل سے شعلے نکلنے لگے

یہ اور اس طرح کے پر نور اشعار تقریباً ہر صفحہ اور ہر غزل میں مل جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ روشنی اور چمک کے مختلف ذرائع اور مختلف شکلوں کو شاعر نے مختلف داخلی و خارجی مناظر و کیفیات کو بڑے جمالیاتی انداز میں مختلف لفظوں میں حسب موقع و ضرورت استعمال کیا ہے۔ مثلاً شعلے' کرنیں' تنویر' فروزاں' چراغاں' آتش نمرود' شعلہ برق' دھوپ' ضیا' وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ ان الفاظ کو نظم ہی نہیں غزل کی نازک صہبا میں بڑے سلیس و سہل ممتنع کے انداز میں نہایت روانی اور قادر الکلامی کے ساتھ جا بجا پیش کرنے پر وہ پوری قدرت رکھتے ہیں۔ آخر جو ٹھہرے داغ دہلوی اسکول (سیماب اکبر آبادی) کے تربیت یافتہ' مسئلہ محض ادبی تربیت کا نہیں بلکہ ابوالمجاہد زاہد کے فکر و نظر کی بنیاد اور اس کے پورے اٹھان کی ہے۔ موصوف کی دینی و علمی تعلیم و تربیت' رامپور جیسے تہذیبی شہر میں عمر کے بیشتر حصے کی عملی زندگی اور برصغیر کی ایک معروف دینی و تحریکی تنظیم سے اوائل عمر سے آج تک ان کی گہری وابستگی کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت اور تزکیہ و تربیت کی روشنی نے ان کے فکر و اسلوب کو منور کر دیا ہے اس لیے جملہ اصناف سخن میں روشنی اور نور سے متعلق الفاظ و استعارات اور تلمیحات کا سیل بالکل فطری انداز میں بہتا رہتا ہے قرآن و سنت کی بنیاد پر تصوف و تزکیہ کی ایک پوری تاریخ بھی انوار و تجلیات سے معمور ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے نکات عجیبہ کے باب میں تصوف کی وجہ تسمیہ "نور معرفت اور توحید کے ذریعہ اپنے باطن کو جملہ آرائشوں سے پاک کرنے کی بنا پر ہے" (حقیقت تصوف از ڈاکٹر محمد طاہر القادری' لاہور ص-۹۴) علامہ اقبال کے لفظوں میں ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

واضح ہو کہ زاہد کسی مریضانہ تصوف کے قائل نہیں' وہ تزکیہ و خدا پرستی میں

کرامت' کی جگہ 'استقامت' کے قائل ہیں۔اور قرآن وسنت کی حقیقی اسپرٹ کو کہیں بھی دھندلا نا پسند نہیں کرتے چنانچہ مجموعہ کلام "ید بیضا" کے باب 'حمد ونعت' کا آغاز 'حمد ونعت' کے فرق جلی کو مٹانے کی نفی کرتے ہوئے صاف کہتے ہیں کہ

ع نعت کو حمد بنانا نہیں آتا مجھ کو

اپنے دینی وعلمی مزاج کے سبب وہ جس بات کے قائل ہیں اسے ان الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ؎

دل بینا بھی کر خدا سے طلب کہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

"قرآن مجید" کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ: ؎

بحمد اللہ! جینے کا نیا ساماں نکل آیا گئی رات اور خورشید ضیا افشاں نکل آیا

اور کیوں نہ ہو کہ اسی قرآن پاک کی سورۃ النور کی نہایت جامع آیت (۳۵) میں خدائی نور کو ایک دلکش علامت کی صورت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

" اللہ نور السموات و الارض مثل نورہ کمشکوٰۃ منہا...... واللہ بکل شئی علیم "

"اللہ ہی آسمان وزمین کا نور ہے' اسکا نور ایک ایسے طاق جیسا ہے جس میں ایک چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس ہے وہ فانوس گویا صاف وشفاف موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے (اور) چراغ شجر مبارکہ زیتون (کے تیل) سے روشن رہتا ہے' جو شجر (زیتون) نہ مشرق کے رخ واقع ہے اور نہ مغرب کے رخ' اس کا تیل (اس قدر لطیف و شفاف ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ) اگر آگ اسے نہ بھی چھوئے تو بھی (خود بخود) بھڑک اٹھے گا (پھر ان منور فضاؤں میں عجب) نور پر نور (کا عالم ہے) اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور

کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کو (سمجھانے) کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے۔ اور اللہ کو ہر چیز کا (پورا پورا) علم ہے"

مفسرین میں ابن کثیر اور علامہ زمخشری وغیرہ نے وضاحت کی ہے کہ یہاں اللہ نے نور کی مثال مومن کے قلب سے دی ہے۔

یہ زاہد کی فکری و فنی خوش بختی ہے کہ ان کی پوری شاعری جلوۂ نور سے معمور ہے موصوف کی اقبالی انداز میں رجائیت سے بھرپور ایک مختصر سی نظم "ہم" ملاحظہ فرمائیں:-

ہم خاک کی معراج ہیں تقدیر زمیں ہیں
ہم اک غزل نور ہیں اک نظم حسیں ہیں
کیا ہم کو مٹائیں گے اندھیرے کے پرستار
ہم صبح یقیں، صبح یقیں، صبح یقیں ہیں
بدخواہ اجالوں کے اندھیروں کے پرستار
شرمندہ تھے، شرمندہ ہیں، شرمندہ رہیں گے
ہم صبح و مہ و انجم و خورشید کی مانند
تابندہ تھے، تابندہ ہیں، تابندہ رہیں گے

اسی کو کہتے ہیں۔

ع نسبت نور تو خود نور بنا دیتی ہے

یہیں پر ایک لیلیٰ اور نئے لب و لہجے کے ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کی شاعری سے زاہد کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دونوں کے فکر و فن کی انفرادیت اور پہچان ایک نئی آگہی عطا کر سکتا ہے۔ زاہد کے اسلامی نظریے کی طرح جاں نثار اختر بھی ترقی پسند فکر و نظر پر یقین کامل رکھتے تھے۔ اس راہ میں کئی طرح کے نشیب و فراز سے بھی گزرے، دونوں نے تقسیم ملک سے بہت پہلے شعر و سخن کا آغاز کیا لیکن بحیثیت مجموعی زاہد کے حالات نسبتاً مقیم

ہوتے ہوئے بھی نظری فرق نے دونوں کے کلام کو بالکل دو رنگ دے دیا ہے۔ جاں نثار اختر کے یہاں نرمی اور بانکپن کے ساتھ مایوسی و محرومی کا بھی برملا اظہار ہے۔

ے سوائے گرد ملامت ملا بھی کیا ہم کو بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

ے ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے لگتا ہے جیسے آج بکھر نے لگا ہوں میں

ے ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

ے روح کی پیاس کے آگے جسم کی پیاس بڑی ہے

ے کس عقیدے کی دہائی دیجئے ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

ے گھر میں پی لیں بھی تو کیا آج بھی یاد آتی ہے فرش مے خانہ پہ وہ لغزش پارات گئے

ان کے خیال میں آج انقلابوں کی گھڑی ہے اس لیے ہر ''نہیں'' ہاں سے بڑی ہے۔ چنانچہ آج آدمی کا وجود دیکھ کے ''ہر فرد ایک سانحہ سا لگے ہے'' آج ہر آدمی ادھورا دکھائی پڑتا ہے کیونکہ

ع ''نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار''

شاید اسی لیے ترقی پسند تنقید کے ایک اہم ستون ڈاکٹر محمد حسن نے جاں نثار اختر کی شاعری کی تمام ترجدت آفرینیوں کو بڑے عالمانہ انداز میں وضاحت کے بعد آخر میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان سب کے باوجود کیا وہ ''اپنے پڑھنے والوں میں کوئی ایسی تبدیلی کر پائے ہیں یا نہیں جو اس کے نزدیک زندگی کی معنویت میں ردوبدل کر سکے...... ایسی تبدیلی جس میں آتش رفتہ کا سراغ بھی ہو اور آنے والی صبح کا نور بھی''

ایک اور بڑے محقق و نقاد خواجہ احمد فاروقی نے جان نثار اختر کی غزلوں کا تفصیلی و تجزیاتی مطالعہ کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا اس کا خلاصہ آخر میں خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''ان میں لطیف رومانیت ہے، جنسیاتی تحلیل ہے، شاعرانہ مصوری ہے،
لیکن کوئی بے کراں جذبہ، کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں ہے''

مگر جاں نثار اختر کے مقابلے ابوالمجاہد زاہد کے یہاں تمام تر محرومیوں اور مصائب و آلام کے باوجود اپنے حدود میں ''ایک بے کراں جذبہ'' بھی ہے اور ''دیوانہ بنا دینے والا احساس'' بھی۔ تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں محض چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے:

؎ دھوپ کے ماروں کو جس کی چھاؤں میں راحت ملے
ریگ زار زندگی میں وہ شجر ہو جایئے
لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لیے
زندگی کی وہ کتاب معتبر ہو جایئے

؎ کچھ تو تھے سنگیں حقائق کچھ حریری خواب تھے
بس کتاب زندگی کے یہی دو باب تھے

؎ تشنگی، تشنگی ہو تو ہر دشت سے
چشمۂ آب زمزم ابلنے لگے

؎ شرط ہے زاہدؔ شعور منزل مقصود بھی
ہر ہجوم رہرواں کو کارواں کہتے نہیں

؎ ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے

؎ خدا کی شان کہ ہم نے جنہیں تراشا ہے
وہ بت بھی شان دکھانے لگے خدا کی طرح

؎ زندگی سے کچھ نہ دینے کی شکایت کیا کروں
سوچتا ہوں میں نے خود بھی زندگی کو کیا دیا

؎ ہم غلامانِ محمدؐ ہیں اجالوں کے سفیر
ہم نے ہر دور میں ظلمت سے بغاوت کی ہے

عزیز بگھروی کی نعت گوئی قندیل حرم کی روشنی میں

"جہادِ حرف" (۱۹۸۸ء) "ناموسِ قلم" (۱۹۹۳ء) اور "حرمت فن" (۲۰۰۰ء) کے معروف شاعر عزیز بگھروی کی حمد اور نعتوں کا مجموعہ "قندیل حرم" اس وقت پیش نظر ہے۔ عزیز بگھروی نے یوں تو مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے مگر وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اور طرز بیان کے اعتبار سے اپنی سادگی و پرکاری میں ممتاز ہیں۔ چنانچہ "قندیل حرم" کی نعتوں میں ان کا مخصوص فن اور پر عزم لب ولہجہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ عزیز بگھروی کی پوری زندگی واضح فکر ونظر، یقین محکم اور عمل پیہم سے عبارت رہی ہے چنانچہ پورے مجموعۂ کلام میں ان کا عزم محکم اور شوق بے پایاں ہر جگہ نمایاں ہے اس مجموعے کا اولین حمدیہ شعر ہے۔

؎ شوق کو پر، حوصلے کو پختگی دیتا ہے کون
ناامیدی میں کرن امید کی دیتا ہے کون؟

اس خیال انگیز سوال کے جواب پر انہیں بہت پہلے سے یقین کامل تھا کہ

؎ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں
فکر کتنی حسین رکھتا ہوں

اردو میں نعتیہ شاعری کی تاریخ اور اسکی روایتیں فکری وفنی اعتبار سے مختلف الجہات رہی ہیں۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کی حیثیت شعری مبالغے کی وجہ سے بعض شعرا کے یہاں متوازن نہیں رہ پائی، رسالت محمدیؐ، توحید خالص میں مدغم دکھائی دیتی ہے تو کہیں اسلام کا تصور توحید، عجمی خرافات کے زیر اثر رسالت محمدیؐ کے زیر نگیں نظر آتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فکر وفن کے لحاظ سے حمدیہ شعر کے مقابلے میں نعتیہ شعر کہنا مشکل

تر ہے کہ یہاں وفورِ عشقِ رسول کو متوازن رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ "قندیلِ حرم" کے نعتیہ اشعار کا کمال یہ ہے کہ یہاں شاید ایک شعر بھی اپنے حدود سے باہر نہیں ہو سکا۔ چنانچہ پورا مجموعہ سیرتِ پاکؐ کے مختلف پہلوؤں اور اداؤں کا ایک حسین مرقع بن گیا ہے۔ اس حد ادب کے باوجود شاعر کے کلام میں عشقِ رسول کی جو چنگاری ہے وہ مسلسل سلگتی رہتی ہے مگر اس کی بھڑکتی ہوئی لو قندیلِ فن میں شعلۂ جوالہ بننے کے بجائے قلب و روح کو پرنور کر دیتی ہے۔ چنانچہ آغازِ کلام ملاحظہ ہو:

؎ سراپا الفت، وفا مجسم، خلوص پیکر کی نعت لکھوں
ڈبو کے خونِ جگر میں خامہ حضورِ انور کی نعت لکھوں

شاعر ہی کے لفظوں میں یہ سب کے بس کی بات نہیں فقط "توفیقِ خدا" کا نتیجہ ہے۔

؎ ہمت والا کوئی اٹھے یا جس کو دے توفیق خدا
شعلوں کو گلزار بنانا سب کے بس کی بات نہیں

خدا اور رسولؐ سے ان کے روایتی کے بجائے قلبی تعلق ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر جگہ نعت جیسے نازک اور لطیف فن کے تقاضوں کو نباہنے میں وہ کامیاب رہے ہیں، انکی مقصدی و تحریکی زندگی کے ریاض نے سچ تو یہ ہے کہ ان کے فن کو جلا بخشی ہے۔ سلیس و فصیح زبان میں اپنے احساسات و جذبات کی آمیزش کے ساتھ سیرتِ رسولؐ کے مختلف مراحل، واقعات اور اسوہ کو پیش کرنے پر انہیں جو قدرت حاصل ہے اسکا اعتراف مشاہیر ادب نے کیا ہے۔ کیونکہ نعت گوئی کے لیے شاعر نے جو معیار و میزان طے کیا ہے ان پر وہ کھرے بھی اترے ہیں۔

؎ نعت وہی ہے نعت ہو جس میں
خونِ جگر بھی شعلۂ جاں بھی

مگر سوال یہ ہے کہ میرؔ و سوداؔ سے عبدالعزیز خالد اور حفیظ الرحمٰن احسن (موج

سلسبیل) تک اردو میں نعت گوئی کے ایک سے ایک فنکاروں کے جھرمٹ میں عزیز بگھروی کی شناخت اوران کی انفرادیت کیا ہے؟ وہ ہے ان کی صلابت فکر، تحریکی مزاج، رجائی انداز اور ہر معاملے یا مسئلے میں ان کا مضبوط و مستحکم انداز بیان۔ یہ خصوصیات ان کی پوری شاعری میں خون کی طرح رواں دواں ہیں۔ اولین مجموعۂ کلام کا نام ''جہاد حرف'' اسکا بہترین اشاریہ ہے۔ ''پتھر میں احساس جگانا، جوئے شیر کاٹ کے لانا، اہل شر سے آنکھ ملانا اور سیل رواں میں پاؤں جمانا'' سچ تو یہ ہے کہ سب کے بس کی بات ہو یا نہ ہو عزیز بگھروی کے بس میں ضرور ہے وہ عمر بھر ان اصولوں کے اپنے تحریکی مزاج کے سبب نہ صرف قائل رہے بلکہ دنیائے فکر وفن میں عامل بھی رہے۔ چنانچہ ''قندیل حرم'' کے مختلف اشعار میں سیرت پاکؐ کے جن پہلوؤں کو شاعر نے اجاگر کیا ہے ان میں یہ پرعزم اور ولولہ خیز انداز کم وبیش ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس مجموعہ کی اولین نعت کے بیشتر اشعار میں حضور کریم کی سیرت پاک کے جن پہلوؤں کو شعری جامہ پہنایا گیا ہے ان کے بعض الفاظ وتراکیب ملاحظہ ہوں۔

حضورؐ اونچی اڑان والے آسمان کی رفعتوں سے گزر جانے والے، شعلہ بار فضا کو رحمت کا سائبان دینے والے، سراپا فقر وغیور اور نظر نظر میں شان والے، عرب میں ان کا کوئی ہمسر تھا نہ عجم میں کوئی برابر، وہؐ عدل وانصاف کے محافظ، صداقتوں کے امین وضامن، بڑے بڑے سرکشان عالم کو زیر کرنے والے تھے'' یہ تو صرف ایک نعت کا خلاصہ ہوا اب اس کا صرف ایک شعر ملاحظہ ہو۔

؎ قدم قدم امتحاں سے گذرا، نفس نفس آزمائشوں سے
ثبات وصبر ویقیں کا پیکر وہؐ ہمتوں کی چٹان والا

اوراس مجموعہ کی آخری نعت کا ایک شعر ملاحظہ ہو

؎ راستہ اس کا روک نہ پائے سیل رواں بھی، کوہ گراں بھی

اس پرعزم اور ولولہ خیز انداز بیان کی نعت میں نباہنے کے اس مشکل عمل کو عزیز بگھروی نے آسان کر کے دکھا دیا۔ کیونکہ وہ اپنی تحریکیت کے سبب عمر بھر "دین محمدؐ کے وفادار، اللہ کے انصار و مددگار نیز عظمت اسلام کے نگہدار سپاہی رہے"۔ ان کا عزم بالجزم ملاحظہ ہو۔

؎ باطل کی خدائی کو گوارہ نہ کریں گے
مر جائیں گے ایمان کا سودا نہ کریں گے

ایک باکمال نعت گو شاعر۔ ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

اردو اور فارسی زبان و ادب کا عام قاری بھی ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کی علمی و ادبی صلاحیتوں سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا ہے۔ ان کی فارسی اور اردو میں تقریباً سترہ کتابوں کی فہرست میں چھوٹے بڑے نعتیہ مجموعوں ہی کی تعداد چھ ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر ان کا تازہ مجموعۂ نعت "شعاع نوا" ہے جسے گوشۂ مکالمات فارسی علی گڑھ نے پچھلے سال (۲۰۱۳ء) زیور طبع سے آراستہ کر کے منظر عام پر لایا ہے۔ جو اردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز مجموعہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ اسکی انفرادیت کا اندازہ "انتساب" سے کیا جا سکتا ہے: "قرآن پاک کی ان آیات کے نام جن میں اللہ جل جلالہٗ کی توحید کی تعلیم دی گئی ہے اور انبیا علیہم السلام کی عبدیت کا بار بار استحضار کرایا گیا ہے"۔ اور دوسرے صفحہ پر "اعلامیہ" کے زیر عنوان بطور خود احتسابی انہوں نے اپنے کسی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نعت یا غزل یا کسی تحریر میں "کسی بھی حیثیت سے قرآن و حدیث سے متصادم نظر آتا ہو تو اس کو قلم زد کر دیا جائے"۔ نیز "میں ہر ایسے فکر و خیال سے توبہ کرتا ہوں اور خدا کی پناہ مانگتا ہوں، جو ذرہ برابر بھی قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے مفاہیم و مرادات سے مبانیت رکھتا ہو!"۔

یہ حزم و احتیاط بعض بڑے مستند اور دیندار شعرا کے یہاں بھی بالعموم عنقہ ہے جیسا کہ علامہ اقبال جیسے جید اسلامی شاعر کے یہاں بعض مقامات پر بے احتیاطی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی نے اس کے قبل اپنے مجموعہ "فروغ نوا" (۲۰۰۹ء کے ص: ۱۷ تا ۲۱) کے بعد زیر نظر مجموعہ "شعاع نوا" کے حواشی (ص ۱۵۷ تا ۱۶۰) میں سید شکیل دسنوی کے ایک مراسلہ کے بعض اقتباسات (بحوالہ ماہنامہ سب رس،

حیدرآباد) سے ثابت کیا ہے۔اقبال کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی واقف ہے کہ ان کی شاعری وقت کے ساتھ بتدریج ارتقا پذیر ہوئی۔ خالص اسلامی شاعری ان کے دور آخر کی تخلیق ہے۔ورنہ متعدد مقامات پر شاعرانہ خاکساری کے انداز میں خود کو "کافر ہندی" اور "لاتی و مناتی" تیز اپنے بارے میں یہ نہ کہتے کہ ع تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گذر! مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ آخر وقت تک "بسیار کوئی" اور "بے راہ شدی کا شکار ہو گئے" یا سید شکیل دسنوی کا یہ کہنا کہ "اقبالؔ، سر محمد اقبال کہلانا تو پسند کرتے تھے، مگر "الحاج محمد اقبال، کہلانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے"۔یا موصوف کا یہ طنز کہ "اس بسیار گو شاعر کو۔۔۔فخر بشرؐ پر کوئی شاہکار نعت نہ سہی ایک روایتی نعت لکھنے میں کون سا جذبہ مانع تھا؟" "اقبال شکنی" کے جذبہ سرشار میں موصوف بانگ درا کی نہایت معنی خیز نعتیہ نظم بعنوان "حضور رسالت مآبؐ میں" اور "شب معراج" کو بالکل ہی بھول گئے یا ممکن ہے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہو۔حضورؐ سے عقیدت اور والہانہ وابستگی کے سلسلے کے نعتیہ نوعیت کے ان کے متفرق اشعار کو بھی مراسلہ نگار نے بڑی چالاکی سے نظر انداز کر دیا ہے۔حالانکہ اقبال کے یہاں ع حامل خلق عظیمؐ اور صاحب صدق ویقیں" کے سلسلے میں مختلف غزلوں اور نظموں کے نعتیہ "متفرق اشعار" ایسے ہیں جن پر بہتوں کی بڑی بڑی نعتیہ نظموں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ان اشعار میں اقبال کے ع دل میں صلوۃ و درود، لب پہ صلوۃ درود" کی روح پرور آواز بخوبی سنی جا سکتی ہے۔اقبال نے اس طرح کے اشعار میں "حسن وعشق" کی جن روایتی علامتوں کو استعمال کیا ہے انہیں فلسفیانہ معنویت سے ہم آہنگ کر کے "خون جگر" کے مفہوم میں عام نعت کو حضرات سے مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ان کے یہاں عشق کا مفہوم ع "معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود" کا حامل ہے۔اور حیرت ہے کہ اقبال نے اپنے آخری ایام میں دربار رسالت میں حاضری سے اپنی محرومی پر جس دلدوز انداز میں " سرودرفتہ باز آید کہ نہ آید" والے قطعہ کو جاننے والا ان کے "الحاج" نہ ہونے پر طنز کرنے کی

کیسے جرات کرتا ہے۔اور اشعار کو جانے دیجئے اردو کی پوری نعتیہ شاعری سے اقبال کے ان دو اشعار کی فکر کے اشعار پیش کرنا کیا کارے دارد نہیں ہے؟۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے　　کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں!
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

بہر حال "شعاع نوا" کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ تقریباً دو سو صفحات کے اس نعتیہ مجموعہ کلام میں ایک چوتھائی نثری صفحات میں اردو کی نعتیہ شاعری کے حسن و قبح کو کھنگال کے رکھ دیا گیا ہے۔ان کے خیال میں بعض ضعیف روایات، شاعر رسولؐ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ کے ایک شعر کے غلط متن اور اسی لیے غلط ترجمے کے سبب حضور کی پوری خلقت، سایہ سے مبرا، غیر بشری جیسی "فکری کجروی اور غیر محتاط تخیلات کی بازی گری" کے نتیجے میں نوبت باایں جارسید کہ

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے　　جو کچھ ہمیں لینا ہے، لے لیں گے محمدؐ سے

شاعر کے خیال میں نعت گو شعرا کی بے راہ روی کے تین بنیادی اسباب ہیں۔ قرآن پاک کے تصور توحید و شرک میں بے اعتدالی، عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان امتیاز کی صلاحیت سے محرومی اور اللہ و رسول کی محبت کو انسانوں کی محبت پر قیاس کرنا۔اسی وجہ سے ڈاکٹر رئیس احمد اپنے نعتیہ کلام میں "عشق، عاشق اور معشوق جیسے الفاظ کو معیوب و مردود سمجھتے ہیں۔دیگر شعرا کی طرح حضور کی شان مبارک میں "تو اور تیرا" جیسے الفاظ سے بھی مجتنب ہیں، حضورؐ کے اسم گرامی کے بجائے احتراماً ان کے ضمائر و صفات کے ذریعہ بات کہی گئی ہے کیونکہ موصوف کے خیال میں قرآن اور حامل قرآن پر ایمان لانے کے معاملے میں "کسی شاعر یا مولوی، کسی پیر یا جوگی، کسی گیانی یا فلسفی، کسی جیلانی یا نجفی، کسی لکھنوی یا تھانوی، کسی دہلوی یا بریلوی وغیرہ وغیرہ پر یا ان کے کلام و اقوال پر ایمان لانے کا ہرگز ہرگز مکلف نہیں بنایا گیا ہے!" نیز اسلامی عقیدے کے مطابق انبیا علیہم السلام اور فرشتوں کے

سوا کوئی بھی (عالم، جاہل، پیر، مرشد، ولی، امام، غازی، شہید وغیرہ) معصوم نہیں ہوسکتا (ص ۱۳)۔

ڈاکٹر رئیس اردو، فارسی اور عربی وغیرہ زبان وادب کے شناسا ہی نہیں اس کے پارکھ بھی ہیں اس لیے اپنے فکر وفن کو قرآنی فکر سے ہم آہنگ ومتوازن رکھا ہے۔ دیگر شعرا کے برعکس وہ تخلیقی اظہار کے اجزائے ثلاثہ تخیل، نظریہ اور فن کی ترتیب کو نعتیہ شاعری میں نظریہ، فن اور تخیل کی ترتیب میں دیکھتے ہیں۔ تاکہ ان کا کلام "نغمۂ انبساط" "نالۂ حسرت" میں نہ تبدیل ہوجائے۔ عقاید ونظریات کے معاملے میں وہ ذرا سی بھی غفلت اور لچک کے قائل نہیں کیونکہ ایسے ہی فکری گمراہی میں مبتلا رہنے والے شعرا کو قرآن نے "فی کل واد یھیمون" کی کیفیت سے دوچار بتایا ہے۔ اپنی فکر صحیح پر یقین کامل رکھنے کی وجہ سے شعاع نوا کے اشعار خون جگر سے معمور اور پرنور ہیں۔

ایک شعر ملاحظہ ہو:

ے ایمان جب ان پر لے آئے اور دل سے انہیں سچا جانا
ممکن ہی نہیں کسی اور طرف اب لوٹ کے اس دل کا جانا (ص ۵۳)

لہذا ذیل کے اس شعر کو تعلی پر نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی سمجھنا چاہیے:

ے لکھ آقا کی نعت رئیس زندہ رہیں گے یہ اشعار

اس پورے مجموعہ میں غزل کی ہیئت اختیار کی گئی ہے اور شاعر کی قادرالکلامی کا کمال یہ ہے کہ ردیف دار طویل اور مختصر بحروں میں یہ نعتیں پیش کی گئی ہیں۔ مگر ہر جگہ معاملہ از دل خیزد بر دل ریزد کا ہے۔ بلا تخصیص دونوں رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ے اہل حق منزلوں پر پہنچ بھی گئے، آپ کے نقش پا دیکھتے دیکھتے
اہل باطل بھٹکتے رہے عمر بھر، راہ میں جانے کیا دیکھتے دیکھتے (ص ۹۷)

ہیں عجیب جلوہ طرازیاں مرے ذہن منظرۂ ساز میں

میں جہاں میں چاہے جہاں رہوں، ہے نگاہ بزمِ حجاز میں (ص ۷۹)

مگر طویل بحروں والی نعتوں کی تعداد بہت کم ہے، چھوٹی بحروں میں سہلِ ممتنع کے انداز سے شعر کہنا قدرتِ بیان کا واضح ثبوت ہے۔

خدا کی بخشی ہوئی ہیں سبھی صفاتِ رسولؐ　　خدا کی ذات کا حصہ نہیں ہے ذاتِ رسولؐ

مجالِ نعت ہے جب تک مری زباں کے لیے　　زباں ہے مدحتِ سرتاجِ انس وجاں کے لیے

اس مجموعے میں شاعر نے مزید کئی اہتمام کیے ہیں مثلاً بعض الفاظ پر ترتیب وار نمبر دیکر حواشی میں ان کی وضاحت کی ہے ذاتِ رسول ﷺ کی وضاحت کرتے ہوئے ''نور من نور اللہ'' کی گمراہی اور اسی طرح کے شعر پر سخت گرفت بھی کی ہے مثلاً

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر　　اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

یا

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر

وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

مجموعہ کا آغاز حمدیہ کلام بعنوان ''لا الٰہ الا اللہ'' کی تین غزلوں سے کیا گیا ہے،اس کے بعد ''ثنائے رسولؐ'' سے پورا مجموعہ معطر ہے۔ آخری حصے میں ایک قصیدہ کے علاوہ ایک عمدہ ''سلام'' بعنوان ''السلام اے شہر گنبد کے مکیںؐ'' مسدس کی ہیئت میں ۳۴ بندوں پر مشتمل ہے۔دوسرا سلام نسبتاً چھوٹا کل سات بندوں کا ہے۔پہلے سلام کا تمہیدی شعر قابلِ توجہ ہے

؎ طیبہ کی سمت بھیج رہا ہوں سلامِ شوق　　احسان کر رہا ہوں نسیمِ بہار پر

اختتامی صفحات پر ''مراجع'' کے زیرِ عنوان ۱۹ تصانیف کا حوالہ دیا گیا ہے۔اس کے بعد ''زندگی نامۂ مصنف'' کے علاوہ ''مطبوعاتِ نعمانی'' اور بالکل آخر میں ''قطعۂ تاریخ اشاعتِ اول شعاعِ نوا'' بزبانِ فارسی ہے۔

سرودہ بہ ارتجال، ہمیں نام را بگفت　　مجموع عدد ''شعاعِ نوا'' سہ بار ۱۴۹۴

۶۰

(۲۰۱۳ء) ۱۴۳۴ھ

پر یہ منفرد و ممتاز مجموعۂ نعت اختتام پذیر ہوتا ہے۔

حواشی ہی میں بعض قرآنی آیات کے بعض الفاظ کے املا میں خال خال کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، توقع ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح ہو جائے گی۔ مثلاً حواشی نمبر ۸..... "غیر الاسلام دینا" کے بجائے "دنیا" "واتممت علیکم" کی جگہ "وائمت" ہو گیا ہے (ص ۱۷۰)۔

کوشۂ مطالعات فارسی علی گڑھ کے زیر اہتمام صوری و معنوی اعتبار سے یہ قابل قدر کتاب گزشتہ سال ۲۰۱۳ء میں طبع ہوئی جس کی قیمت ایک سو پچاس روپے نہایت مناسب ہے توقع ہے کہ اہل ذوق اس مجموعہ کی قدر افزائی کریں گے۔

فیض کی شاعری میں جبلتی شعور

ہابس نے ایک موقع پر غلط نہیں کہا تھا کہ دنیا کی ہر حقیقی شئے مکاں یا زماں کے اندر ہے، اس لئے یا تو وہ مادہ ہے یا حرکت۔ اس کے نزدیک فطرت میں سب سے کلی علت حرکت ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی محض حرکت کا نام ہے، کیوں کہ زندگی اپنی بقا اور پر مسرت خواہشوں کی تکمیل کے لئے ہمیشہ متحرک رہتی ہے۔ اس تحرک کا شعور انسان حواس خمسہ سے کرتا ہے۔ بعض ماہرین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ حس ہمارے بیشتر علم کا مبدا ہے۔ یہ ان طبیعاتی حرکات سے عالم وجود میں آتی ہے جو اجسام خارجی ہمارے آلات حس کی طرف منتقل کرتے ہیں چنانچہ تمثیل اور حافظہ محض حس کی کمزور اشکال ہیں۔ یہ ان حرکات کی باقیات پر مشتمل ہوتے ہیں جو ابتدا حس کی صورت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصور لذت و مسرت کو حرکت خواہش اور تصور کرب و الم کو حرکت نفرت کے احساس کا مترادف قرار دیا گیا۔

ماہرین جمالیات کے خیال میں نفس جمالیات بھی اس تحرک سے خالی نہیں۔ ''حسن کے مختلف نمونوں کا فرق خاص طور سے اس ہیجان کی نوعیت پر منحصر ہے جو غلبہ رکھتا ہو۔ شئے جمیل کی تخلیق و تحسین کی صورت میں یا تو مختلف ہیجانوں کے مابین، جمہوری توازن ہوتا ہے یا تعمیر کے رجحان کا غلبہ ہوتا ہے۔ مقدس شئے کی صورت اطاعت کے ہیجان کا، نازک شئے کی صورت میں تحفظ کے ہیجان کا، طربیہ میں خندے کے ہیجان کا، المیے میں انفعالی ہمدردی کا اور غنائیہ میں جنس کے ہیجان کا غلبہ ہوتا ہے۔''[1]

فلسفیانہ زبان میں اسے یوں کہا گیا کہ ''حسن مطلق، اپنی موضوعیت میں ناقابل تغیر ہے لیکن اپنی معروضی اور اضافی حیثیت میں تغیر مدام کے رنگ سے مزین ہے اور یہ تغیر

---

[1] محمد میاں شریف ''جمالیات کے تین نظریے'' مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۶۳ء، ص ۱۷۸۔

مدام حقیقت میں ارتقائی ہے (کل یوم ہو فی شان) انسانی فطرت چونکہ فطرت الٰہی پر مبنی ہوئی ہے لہذا انسان کے حسن، زندگی کی بقا اور ارتقا دوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسن مطلق کی طرح موضوعی اعتبار سے ہمیشہ ثابت و قائم رہے اور معروضی لحاظ سے سدا حرکت ارتقائی کے عالم میں رہے۔"[1]

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس بنائے تحرک یا حسن مطلق کو مختلف محققوں نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ کبھی اسے "تحریک ذہنی" (بارڈور بن فرانسیسی) کہا گیا، تو کبھی "ترغیب جنسی" (فرائیڈ) کسی نے "قوت نفسی" (ایڈلر) کہا، تو کسی نے "جدلیاتی عمل" (ہیگل، مارکس) کوئی اسی کو "جوش وجدان" (برگساں) کہتا ہے تو کوئی "ذات اندیشی" (میکڈوگل) کوئی "اظہار ذات" (کروچے) بتاتا ہے تو کوئی "تعمیر خودی" (اقبال) سے تعبیر کرتا ہے۔

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

مگر فرد کی یہ حرکت پذیری دو رخی ہوتی ہے۔ سہولت کے لیے اسے جبلتی اور نصب العینی حرکت پذیری کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ جبلتی عمل کے ماتحت ہر مخلوق ان تمام چیزوں کی طرف کشش محسوس کرنے پر مجبور ہے جو اس کی زندگی کو قائم رکھنے والی ہے۔ اس کے برعکس وہ ان چیزوں سے نفرت اور گریز کرتی ہے جو اس مخلوق یا اس کی نسل کے لیے خطرناک ہو، مگر انسان کی انسانیت اس کی عظمت اور ادبی و شعری کاوشیں دراصل نصب

---

[1] نصیر احمد ناصر "تاریخ جمالیات"، ص ۲۴۱۔

العینی عمل پر منحصر ہیں جو بنیادی طور پر تین محبتوں پر مشتمل ہیں:۔

اولاً صداقت کی محبت جو انسان کو کائنات کے متعلق صحیح اور سچے حقائق کا علم حاصل کرنے پر ہمیشہ اکساتی رہتی ہے۔

دوم عمل خیر کی محبت جو انسان میں اس کے اخلاقی اقدار کے مطابق اس کو عمل کے لیے متحرک کرتی رہتی ہے۔

سوم حسن و جمال کی محبت جو اسے تحسین و تخلیق پر ابھارتی رہتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے بیشتر کام جسمانی آسودگیوں کے لیے نہیں بلکہ روحانی اور دماغی اور عقلی مسرتوں کے حصول کے لئے بروئے عمل آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حسن، صداقت، افادیت اور نیکی فنکار اور قاری کو متحرک اور ہم آہنگ کرنے میں بنیادی رول ادا کرتی ہیں۔

یہ بھی انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ پیدائش سے لے کر سن شعور تک اس پر بالعموم جبلتی شعور کا غلبہ رہتا ہے۔ تخیل و جذبات میں اتھلا پن مستقبل سے بے نیازی اور سامنے کی چیزوں کی طرف لپک، عجلت اور یک رخاپن، رومانیت، بھوک، جنس اور دوسری جبلتی کشش اس شعور کی چند خاص علامتیں ہیں جو بتکرار ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ دنیائے شعر و ادب کی پوری تاریخ کا ابتدائی حصہ بالعموم داستانوں، مافوق الفطری کہانیوں اور سطحی رومان سے اسی لیے لبریز نظر آتا ہے کہ وہ پورا دور ہی دراصل جبلتی گرفت میں تھا۔

اس کے برعکس نصب العینی شعور پختگی سمجھ کے ساتھ ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ جس کی تین خصوصیتیں بالکل واضح ہیں یعنی اساسی استحکام و ثبات، داعی عمومی افادیت اور اعلیٰ ارتقائی صلاحیت۔ جس نصب العین کی یہ تین خصوصیتیں پھیکی اور کمزور ہوں گی وہ اتنی ہی تنگ اور بے کیف ہوں گی، ان کی آفاقی اپیل بے اثر اور ان کی پرواز محدود ہوگی۔

تجربہ شاہد ہے کہ بعض انسان نفسیاتی اعتبار سے زندگی بھر جبلتی گرفت سے آزاد

نہیں ہوتے اس لیے وہ عمر بھر بھڑکیلی اور چمکدار چیزوں کی طرف رومانی کشش محسوس کرتے رہتے ہیں۔ وہ ملائمیت، خوش مذاقی، تخیل کی بلند پروازی اور اپنی یوٹوپیائی جنت کے سرور میں زندگی بھر مست رہتے ہیں۔ بعض جلد ہی اس کی گرفت سے آزاد ہو کر نصب العینی شاہ راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ وہ ماضی اور روایت کے تجربوں سے استفادہ کر کے حال کو سنوارنے اور مستقبل کو نکھارنے کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ نت نئے تجربوں او رنئے ادراک کے ساتھ فکر و خیال میں وسعت و لطافت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تو ان کے کارنامے پھر اسی طرح آفاقی قدروں کے امین بن جاتے ہیں۔

اردو ادب و شاعری نے غالب و سرسید کے دور سے چونکہ پختہ فکری کی منزل میں قدم رکھا اس لیے ان سے پہلے کا ادب عام طور سے جبلتی ادب کہے جانے کا مستحق ہے۔ البتہ سرسید کی عقلیت اور سید احمد بریلوی کی مقصدیت نے ایک نیا شعور بخشا، جس نے آگے چل کر شبلی، حالی، اکبر، پریم چند، اقبال، جوش، اور حفیظ وغیرہ کو پوری طرح متاثر کیا۔ مگر اس کے بین بین جبلتی مزاج اور شعور کی گلکاری بھی بہر حال جاری رہی چنانچہ سرشار و شرر کے معاً بعد سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، اختر شیرانی، مہدی افادی اور سجاد حسین انصاری کی رومانیت کا بھی ایک عرصہ تک بول بالا رہا۔

اس پوری صدی میں چونکہ کلام اقبال کا تاثر سب سے گہرا اور دیر پا رہا اس لیے ان کی عقلیت، استدلالیت، حقیقت نگاری اور رومانیت نے اردو ادب کو بڑے ہمہ گیر انداز میں متاثر کیا۔ اب پورا قافلۂ ادب بھی چونکہ پختہ عمری کی منزل میں داخل ہو چکا تھا اس لیے جبلتی اور نصب العینی دونوں مکاتب فکر نے اپنی انفرادیت کے باوجود زیادہ تہہ دار اور معنی خیز روپ اختیار کیا۔ جبلتی یا رومانی جھکاؤ رکھنے والے جدید فنکاروں میں محمد حسن عسکری، سجاد باقر رضوی، سلیم احمد وغیرہ نے رومانیت اور عصری حسیت کے امتزاج سے ایک نیا رنگ پیش کیا۔ اسی طرح نصب العینی مکتبۂ فکر نے اجتماعی لاشعور، نسلی سرمایہ، روحانی و ثقافتی عناصر

پر مشتمل ادبی قوس وقزح کا ایک نیا منظر نامہ سامنے لایا۔ان میں وزیر آغا، سہیل بخاری، رشید امجد، ابن فرید اور عبدالمغنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس پورے تاریخی پس منظر کی طرف اشارے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ کلام فیض کے ناقدین انکی "رومانی اور انقلابی شاعری" کی دھوپ چھاؤں سے عام طور پر مغالطہ کے شکار ہوئے ہیں۔ان کی رومانی اور سیاسی نظموں کو دیکھ کر یہ حکم لگایا کہ فیض کے یہاں رومان سے حقیقت کی طرف گریز ہے۔ان کے یہاں حال کا ٹھہرا ہوا شعور ہے۔انہوں نے روشن مستقبل کی امید یا انتظار کی تفسیر اور اس کا شفاف آئینہ پیش کیا ہے وغیرہ۔جبکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ فیض کی پوری شاعری جبلتی شاعری کا

ایک خوبصورت مگر متحرک نمونہ ہے۔ان کی رومانی جبلت خواب یا جمود کی دلدل سے جلد ہی نکل آئی اور پھر برابر فعال اور متحرک رہی۔چنانچہ فیض کی یہی تحریکیت اگر ایک طرف ان کا اصل سرمایہ ہے تو دوسری طرف ناقدین ومحققین کے لیے دھوکے کا سبب بھی۔اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ "نقش فریادی" سے لے کر "سرِ وادیٔ سینا" اور حال تک کی غیر مدون نظم وغزل میں ان کا پورا ڈکشن رومانی اور خالص رومانی ہے۔اور دوسری دلیل یہ کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جس "انقلاب" کی نشان دہی کی جاتی ہے اس کی دنیا بھی جبلت بھوک اور تحفظ ذات تک محدود ہے۔فیض خود بھی "غم جاناں اور غم دوراں کو ایک ہی تجربے کے دو پہلو" بتاتے ہیں۔ان کی نظریاتی جدوجہد اور عملی سیاست کے دوران جیل کے مسلسل تجربوں نے انہیں جبلتی شعور کی گرفت سے پوری طرح آزاد ہو کر نصب العینی شعور کو اختیار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"فیض از فیض" میں موصوف خود ہی حسرت، جوش، حفیظ اور اختر شیرانی کی رومانیت کے گہرے اثرات کے بعد ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں جیل کی "رومانیت" کی توجیہہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"جیل خانہ عاشقی کی طرح ایک بنیادی تجربہ ہے (یہاں) ابتدائے

شباب کی طرح تمام حسیات یعنی SENSATIONS پھر تیز ہو
جاتی ہیں اور صبح کی لَو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ ہوا کے
گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے....."

مزید یہ کہ:

"نقشِ فریادی" کے بعد دو کتابیں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ"
اسی جیلخانہ کی یادگار ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انہی ذہنی
محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی
محبت" سے شروع ہوا تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ فیضؔ کی شاعری پر جبلتی شعور کی گرفت بے حد مضبوط ہے، جہاں وہ اس گرفت سے نکل کر اقبالؔ اور دوسرے آفاقی شاعروں کی طرح ہمہ گیر نصب العینی شعور کی حدود میں قدم رکھنا چاہتے ہیں تو وہیں سے بے رس قوالی، بے اثر مرثیہ، بے کیف گیت اور نثریت زدہ نظموں کے غیر شعری طلسم میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ان حدود میں ناکامیاب ہیں۔ فیضؔ نے چونکہ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں اس لئے ان کی اجتماعی قدر بھی شخصی قدر کی طرح ان کا ذاتی احساس معلوم ہوتی ہے۔ ان کے ردِ عمل میں خلوص اور شدت ہے۔ وہ اس شدت کو جدت اور اپج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی نرم خوئی اور لطافت بیانی دھیمے دھیمے سروں میں نغمہ بار محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ بظاہر تمام تلخ و ترش حقائق بھی رومان انگیز روپ دھار لیتے ہیں۔

مگر ان کی یہ رومانیت تحرک سے لبریز ہے اس لئے زیادہ دلکش ہے۔ یہاں شخصی فعالیت بھی ہے اور اجتماعی فعالیت کا عکس بھی۔ شخصی فعالیت سے مراد یہ کہ کسی خاص خیال کا حامل ہو کر جب ایک شخص جدلیاتی عمل سے دوچار ہو جاتا ہے تو وہ اس مفروضہ خیال کا پرستار ہونے کی وجہ سے اس خیال کو تقویت پہنچانے والے ہر عمل اور اشارے کا شیدا اور اس کو

نقصان پہنچانے والے ہر فعل کا دشمن بن جاتا ہے۔اس عمل اور ردعمل کے دوران کبھی کبھی کسی نکتہ پر سمجھوتے کی بھی نوبت آتی ہے جس سے اس کی شخصیت یا تو آگے بڑھ جاتی ہے یا کچھ پیچھے چلی جاتی ہے۔اجتماعی فعالیت سے یہ مراد ہے کہ کوئی ملک قوم یا گروہ انسانی کسی نظریہ کی بنیاد پر مفاد عامہ کا ایک اصول مرتب کرتا ہے تو اس گروہ کا ہر شخص اس سے گہری عقیدت مندی رکھتا ہے۔تاریخی شعور اور علمی واقفیت کے ساتھ اس کی عقیدت مندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔تیسرے قدم پر یہ عقیدت مندی اسے مجنونانہ عمل پر اکساتی ہے اور چوتھے مرحلے میں اس

سلسلے کے عملی نمونوں اور قربانیوں کی مثالوں سے اس نظریہ کے حاملین میں غضب کا جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔

ادب وفن میں مذکورہ بالا دونوں طرح کے تحرک کی مثالیں ملتی ہیں۔مگر یہ تمام عوامل جب تک فنکار کی شخصیت کا جزو بن کر اس کی پوشیدہ احساسی کروٹوں کا حصہ نہیں بن جاتے اس وقت تک اس کے جمالیاتی ذوق اور شخصی ردعمل کا جزو لاینفک نہیں بن پاتے۔

شخصی فعالیت دراصل جبلتی شعور کے زیر اثر ہوتی ہے مگر اجتماعی فعالیت نصب العینی شعور کے ماتحت ہے۔فیضؔ چونکہ مزاجاً جبلتی شعور کے حامل ہیں اس لیے ان کی ترقی پسندی ان کا نصب العینی شعور نہ بن سکی۔اسی لیے ان پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب ترقی پسندوں نے ان کی رومانیت پر کڑی تنقیدیں شروع کر دی تھیں۔پھر بھی ذاتی اور نجی سطح پر انہوں نے اپنے مقصد زندگی کو جس والہانہ جوش، سرمستی اور جمالیاتی انداز کے ساتھ اپنایا ہے اس کی تحریکیت اور اثر آفرینی ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہے۔یہیں سے ان کا رومان ماضی میں حسرتؔ، جوشؔ اور اخترؔ شیرانی کے روایتی رومان سے الگ ہو جاتا ہے اور اس کی جذباتی اپیل دو آتشہ ہو جاتی ہے۔فیضؔ کا یہ حسین جبلتی شعور آگے چل کر ایک نئے انداز سخن کا سنگ میل بن گیا۔چنانچہ آگے کی منزل میں ساحرؔ، مجازؔ اور جاں نثار اخترؔ وغیرہ نے بھی کلام فیضؔ

سے جمالی حرکت وحرارت کا اکتساب کیا۔

طوالت کا خوف اگر مانع نہ ہوتا تو فیض کے جبلتی شعور اور مذکورہ بالا تحریکی عناصر اربعہ پر مفصل گفتگو ممکن تھی۔ذیل میں ان کی پوری شاعری کے مختلف ادوار سے کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن میں شاعر کا بنیادی تحریکی رجحان اور اس کا جدلیاتی عمل بالکل واضح ہے ۔

(۱) اے کہ تو رنگ و بو کا طوفان ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے !
دو گھڑی اور ہے شباب بہار
آ کہ کچھ دل کی سن سنائیں ہم !
آ محبت کے گیت گائیں ہم !

----

(۲) آج پھر حسن دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تصویر

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق

کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ!
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط!
آپ ہی کہیئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے!
اپنا موضوع سخن انکے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن انکے سوا اور نہیں

---(موضوع سخن از نقش فریادی)

(۳) گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے بہاروں کے چمن زاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات سنوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں

کس طرح عارض محبوب کا شفاف بلور
یکبیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کیلئے جھکتی ہے خود شاخ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر

(۴) (مرے ہمدم مرے دوست از دست صبا)

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اٹھے گا
حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشن دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں
دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تیری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا

.....(درد آئیگا دبے پاؤں۔ از زنداں نامہ)

(۵) کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آباد، جدائی میں مسافر صورت
بے خبر گذری پریشانیٔ امید لئے

گھول کر تلخیِ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یاران قدح خوار کے نام
حسنِ آفاقی و جمالِ لب و رخسار کے نام

(قیدِ تنہائی۔ازدستِ تہہ سنگ)

(۶) مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
ترے در پہ آ کے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضور میں آ رہوں
یہ نہ ہو تو سوئے عدم میں پھر ایک بار روانہ ہوں

(آرزو۔ازسرِ وادیٔ سینا)

افتخار راغبؔ۔ایک البیلا فطری شاعر

کئی مطبوعہ مجموعہ کلام کے شاعر افتخار راغبؔ پیشہ کے اعتبار سے ایک سول انجینئر، ذوق کے اعتبار سے فطری شاعر اور فکر کے اعتبار سے تعمیر پسند تخلیق کار ہیں۔اس وقت ان کا نیا مجموعہ "غزل درخت" راقم الحروف کے پیش نظر ہے جس میں تقریباً ستر غزلیں ہیں۔

فطرت میں جو سادگی و بے ریائی کے ساتھ حسن آفرینی ہوتی ہے وہی خصوصیات ایک فطری شاعر کے یہاں پائی جاتی ہیں، افتخار راغبؔ کی خوش نصیبی کہ وہ ان خوبیوں سے متصف ہیں۔کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پوری شاعری سہل ممتنع کی شاعری ہے۔صاف، سادہ، سلیس و فصیح مگر معنی خیز اور فکر انگیز۔اس لیے بہت آسان اور دلکش ہوتے ہوئے بھی جملہ تہداریوں پر عبور حاصل کرنا مشکل ہے۔ہوا اور پانی کس قدر سہل الحصول ہیں مگر انہیں اپنی مٹھی میں قابو کرنا ناممکن ہوتا ہے یہی حال راغبؔ کی شاعری کا ہے کہ ہر شعر دل کو چھو تو لیتا ہے مگر اس کی چوپہل کیفیات کو قابو میں کرنا مشکل ہے۔

راغبؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کی ذہنی کیفیات کی بہترین عکاس ہے، جس کا ہر شعر مختلف جذبات اور مختلف مشاہدات کا عکاس ہوتا ہے۔چنانچہ راغبؔ چوٹ کھائے ہوئے دل اور نیرنگئ زمانہ کے مختلف نشیب و فراز اور اپنے فکر و نظر کے مختلف تجربات و مشاہدات کو اس سادہ و سبک انداز میں پیش کر دیتے ہیں کہ قاری کچھ دیر تک حیرت زدہ سا رہ جاتا ہے۔کیفیات عشق و محبت غزل کا ہمیشہ سے محبوب موضوع رہے ہیں۔راغبؔ کا انداز دیکھئے۔

؎ محبت کی ہوا جب دل میں پہلی بار چلتی ہے
نہ پوچھو کس قدر ہر سانس نا ہموار چلتی ہے

ہر اک ذرہ مہکتا ہے وہاں مشک ختن جیسا
ہوا ان کی گلی میں کتنی خوش بودار چلتی ہے

چین اک پل نہیں مجھے راغبؔ
ہو گیا ہے نہ جانے کیا مجھ کو

بے سبب راغبؔ تڑپ اٹھتا ہے دل
دل کو سمجھانا پڑے گا ٹھیک سے

غالب نے شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا تھا کہ ع اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے اسدؔ۔ راغبؔ کے اس طرح کے اشعار پر عصر حاضر کے میر، کلیم احمد عاجزؔ نے لکھا ہے کہ یہ ''ٹھیک سے'' ہزاروں سال کے بعد آتا ہے، نرگس کو بہت رونا پڑتا ہے''۔ (بحوالہ ہفتہ وار سیاست مڈل ایسٹ ایڈیشن، قطر مورخہ ۱۳ر اگست ۱۳ء۔ ص ۱۲) راغبؔ کو دور جدید کا کلاسیکی شاعر کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

میں اپنے بدن میں بے ٹھکانہ — مل جائے مجھے پناہ کوئی

کے بارے میں کلیم احمد عاجزؔ کا تاثر یہ ہے کہ ''قدامت سے جدیدیت تک کا سفر ایسی چابکدستی سے کرنا ہر شخص کے بس کا نہیں کہ ع جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا'' موصوف راغبؔ کے اس شعر

میں سب کی بھلائی چاہتا ہوں — ہے میرا بھی خیر خواہ کوئی

کو سو سال پہلے شادؔ کے شاگرد، بیتابؔ عظیم آبادی کے اس شعر کا ہم پلہ قرار دیا جسے سن کے سب نے اس طرح پر اپنی غزلیں چاک کر دیں کہ اس شعر کے بعد اس طرح پر کون غزل پڑھے گا

سبیل ساقی کوثر نثار ہے جاری — پکار ہے کہ کوئی بادہ خوار باقی ہے؟ (بیتابؔ)

''پکار ہے کہ کوئی بادہ خوار باقی ہے؟'' اور ''ہے میرا بھی خیر خواہ کوئی'' دونوں ایک

قبیلے کے ہیں اور کسے کہ کشتۂ نغدا زقبیلۂ مانیست"۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ راغبؔ قدیم کلاسیکی انداز ہی کے شاعر ہیں، ان کے کلام میں ان کی زندگی اور زمانہ کی نیرنگیوں کی مختلف جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جس غزل کے دو اشعار آغاز میں پیش ہوئے ہیں اسی غزل میں شاعر نے بڑی سادگی کے ساتھ اس متضاد حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ کہیں کچی سڑکوں پہ آج بھی بیل گاڑی چلتی ہے تو کہیں سورج کی کرنوں سے موٹر کار چلائی جارہی ہے۔ اپنے ماحول میں عمل اور ردعمل کا یہ حال ہے کہ "ادھر میں سر اٹھاتا ہوں ادھر تلوار چلتی ہے"۔ ان کی فکری صلاحیت اور فنی سلامتی بھی دیکھئے کہ انہوں نے اسی غزل کے ایک شعر میں "اخلاق و کردار" کے مقابلہ میں "شوخیِ گفتار" کو حقیر تر دکھایا ہے۔ لہذا شاعر کی کم سخنی اور محتاط بیانی کو ان کی سست روی پر محمول نہ کیا جائے۔ کیونکہ شاعر کی فکر "روشنی رفتار چلتی ہے"۔ یہیں پر ان کے پیشہ ورانہ مہارت کو تخلیقی رنگ و آہنگ میں دیکھنا ہو تو یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

ے یہ کیا نقشے میں تم نے ہر طرف شیشہ دکھایا ہے
مرے بھائی یہاں بس اینٹ کی دیوار چلتی ہے

قدیم و جدید اور ماضی و حال کا یہ سنگم دراصل ان کی سلامتیِ فکر و نظر کا حاصل ہے۔ راغبؔ روایت کی اندھی تقلید کے اگر ایک طرف مخالف ہیں تو دوسری طرف ماضی کی صحت مند قدروں سے اپنی آنکھیں روشن بھی کرتے ہیں۔

ے آنسو بہت بہے مگر آنکھیں چمک اٹھیں ماضی کو اپنے دیکھا جو ہم نے پلٹ کے آج

راغبؔ کا تعمیری نقطہ نظر ہی وہ بنیادی پتھر ہے جو ان کے فکر و نظر کو ہر حال اور ہر بیان میں متوازن رکھتا ہے۔ وہ حقائق حیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ

ے زندگی کا عظیم مقصد ہے یہ کسی گلستاں کی سیر نہیں

اسی لیے وہ ہر سخنور کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

ے ہر سخنور کو چاہیے راغبؔ بے تکی واہ واہ سے بچنا

ے دو چار دن کی عزت و شہرت کے واسطے
کچھ لوگ بیچ دیتے ہیں ایمان بے دریغ

ان کے اشعار میں جابجا قرآنی حقائق بڑے شاعرانہ انداز میں آگئے ہیں۔ وہ زندگی بعد موت پر ایمان رکھتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ ''پھر اٹھایا جاؤں گا مٹی میں مل جانے کے بعد'' نیز اخلاقی قدروں کے معاملے میں قرآنی تمثیلوں کو بھی بڑی خوبی سے نظم کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر:

ے کیا بتاؤں کر کے میری غیبتیں نوش فرماتے ہیں کچھ احباب کیا؟

اب ''اذ الشمس کورت (جب سورج کورت لپیٹ دیا جائے گا۔ سورہ ۸۱، تکویر) کا شاعرانہ اظہار دیکھیے:

ے ساری کرنیں وہی لپیٹے گا جس نے بخشی حیات سورج کو

اسکے علاوہ وہ اسلامی و قرآنی اخلاقیات کے معروفات و منکرات کو اپنے تخلیقی اظہار کا موضوع بنانے میں بھی نہیں جھجکتے۔ لطف یہ ہے کہ اس اظہار میں وہ فنی طریق کار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ قرآن و حدیث کے محض ایک ایک بیان پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے۔

ے خدا کے حکم پہ جھک جائے دل فرشتوں سا نہ ہو غرور تو شاید اگر مگر بھی نہ ہو

تلبیس ابلیس کے پورے واقعے کو شاعر نے محض ''اگر مگر'' سے جس طرح موثر بنایا ہے یہ زبان و بیان پر ان کی قادرالکلامی کا واضح ثبوت ہے۔ اب ایک حدیث کا شاعرانہ اظہار بھی قابل توجہ ہے۔

ے قضا کا وقت ہو یا سامنے قیامت ہو لگا سکیں تو لگا دیجیے شجر پھر بھی

اسی لیے راغبؔ کبر و ریا کے مقابلے میں خاکساری اور فتنہ پروری و عیاری کے

مقابلے میں اخلاص وایثار کی قدروں کے فروغ کو جا بجا بڑے حسین اور موثر انداز میں شعری جامہ پہناتے ہیں۔ سب کی مثالیں پیش کرنا طول عمل ہوگا۔ صرف ایک شعر ملاحظہ ہو

کیا پتا عظمت انکسار　　　　خود نماؤ تمھیں کیا پتہ

ایک خاص بات جو تعمیر پسند فنکاروں کے یہاں تقریباً قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے ہر حال میں ان کا رجائی انداز بیان۔ حالات خواہ کیسے ہی نا گفتہ بہ ہو جاتے ہوں ایک خدا پرست تخلیق کار خود کو بالکل مایوس و نامراد کبھی نہیں محسوس کرتا کہ اسکا ایمان ''ان اللہ مع الصابرین اور لاتقنطو من الرحمتہ اللہ'' پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اقبال کے لفظوں میں ''امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں''۔ اب راغبؔ سے سنیے:

ترى سارى بخشش وفضل پر میں سراپا شکرو سپاس ہوں
مرے دل میں صبر و قرار ہے مجھے ہو گا رنج و ملال کیا

میں سب کا ہوں افتخار راغبؔ　　　اک گل نے ہے مجھکو خار جانا
نہیں غلام ہم اس کے سوا کسی کے بھی　　　ہمارے دل میں کسی دوسرے کا ڈر بھی نہ ہو
غلبہ شعر و سخن سوز محبت کے طفیل　　　حوصلے گرمیٔ افکار سے مل جاتے ہیں
آتا نہیں نظر کوئی راغبؔ اٹھائے سر　　　صادر ہوا ہے پھر کوئی فرمان بے دریغ

غالب نے کبھی کہا تھا کہ ''نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی پرواہ'' اب راغبؔ سے سنیے:

مرکز توجہ ہے فقط کام پہ راغبؔ　　　انعام سے واقف نہ میں اکرام سے واقف

اس رجائیت کا یہ مطلب نہیں کہ درد و غم، مہاجرت کے کرب اور آلام روزگار سے شاعر غیر متاثر ہے۔ شاعر کا اصل کمال یہ ہے کہ مذکورہ تمام تلخ حقائق کے باوجود اس نے اعتدال و توازن کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ شاعر نے رزق حلال کے لیے اپنے دیس کی مٹی اور اسکی سوندھی سوندھی خوشبو سے دور صحرا نوردی اور دھوپ کی شدت کو جس طرح مجبوراً گوارہ کیا ہے اس لیے خود کو ''شاعر عجز'' سے تعبیر کیا تو کبھی اپنے کو '' گملے میں لگے

پھول" سے تشبیہ دی اور خود کو "ٹوٹے ہوئے پتے کی حکایت" سے منسوب کیا ہے:

کیا پتا ٹوٹے پتوں کا کرب اے ہوا تو تمہیں کیا پتا
لے جائے جہاں چاہے ہوا ہم کو اڑا کر ٹوٹے ہوئے پتوں کی حکایت ہی الگ ہے

چنانچہ اس مجموعہ کا نام بھی "غزل درخت" رکھا گیا ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود شاعر کی سلامتی فکر اور حسن بیان میں کہیں انتہا پسندی نہیں آتی۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی سلامت روی اور شگفتہ بیانی میں تلخی ایام نے ان کی شیریں گفتاری میں اضافہ کیا، فکر میں بلندی اور نظر میں گہرائی و گیرائی بخشی، لہذا تعالی کا یہ شعر مبنی بر حقیقت ثابت ہوا

تو ہے سخن کا تاج محل اے مری غزل کیا داد کوئی دے ترے نقش و نگار کی

سچ تو یہ ہے کہ راغبؔ کے اس "تاج محل کے نقش و نگار" کا تجزیہ و تحلیل بذات خود ایک اہم موضوع ہے جس پر ناقدین و محققین ادب کو یکسوئی سے غور و فکر کرنا چاہیئے۔ راغبؔ نے اپنے فکر عمیق اور خیال بلند کو جا بجا جس سادگی و بے تکلفی سے اشارے کنایوں اور باتوں باتوں میں پیش کیا ہے۔ اس نے ان کی شاعری کو ان کے معاصرین کی شاعری سے ممتاز و منفرد بنا دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لفظوں میں ترے حسن کی تنویر بسالوں اے کاش کہ اشعار کی توقیر بڑھالوں
خوشبو سے تراشوں میں ترے حسن کا پیکر رنگوں سے گلوں کے تری تصویر بنالوں

اس خوش رنگی و خوش بیانی کے ساتھ یہ عزم بالجزم بھی بہتوں کے لیے قابل رشک ہے:

ظالم سے لڑوں گا میں قلم ہاتھ میں لے کر دشمن کی یہ کوشش ہے کہ شمشیر اٹھالوں

راغبؔ عام فہم اور آسان ترین الفاظ کو اپنے خون جگر میں ڈبو کر ایسے سیاق و سباق میں الٹ پلٹ کے پیش کرتے ہیں کہ ان کی معنویت تہدار اور رد و چند ہو جاتی ہے۔ یہاں دو اشعار میں خبر اور قبلہ و قبیلہ کے سیاق میں انکی معنی آفرینی پر غور کیا جائے:

کیا جانے کیا ہو ردِ عمل کچھ خبر نہیں جائے گی جب خبر مری اس بے خبر کے پاس

اور سادگی سے مری نہ جانے کیوں خوف و دہشت میں مبتلا ہے وہ

یکجا تھے سارے فہم و فراست میں پست لوگ
قبلہ بنے ہوئے تھے قبیلہ پرست لوگ

الفاظ کے توڑ پھوڑ اور ہفوات کو جدت پسندوں کے برعکس شاعر الفاظ و معانی کے اٹوٹ رشتے پر یقین کامل رکھتا ہے۔

الفاظ میں جدت ہے مانے گا کہاں کوئی گر کوئی تعلق ہے الفاظ و معانی میں
چشم پوشی حال کے احوال سے جانتے ہو حال مستقبل میں فرق

حسب موقع آسان فارسی ترکیبوں کو حسین انداز میں استعمال کرنے کا راغب گر جانتے ہیں مثلاً "برگ بے شجر، پرنور، شعلہ ادا، پابند ماہ وسال، وفا کُل، رسم زندگی، فروغ امن واماں، عہد نظارہ، انداز ستم، فتنۂ اشتباہ، کاسہ بدست، قبیلہ پرست، زینت زنداں، کج ادا، دلِ خوش فہم، کم سخن، فکر دامن گیر وغیرہ" مگر ان سادہ فارسی ترکیبوں سے زیادہ راغب کے یہاں ہندی کے سادے سلونے الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے مثلاً سمے، اوسے، سکھ، چین، گمبھیر، ابھرا، اکہرا، پیت، دوشی، دہرا، کٹہرا، مل جانا، دل وارا کرنا، بزم چارہ، کھلنا، ننھا دیپ، دکھاوا، جیتے جی، سورج مکھی وغیرہ۔ اسی طرح کم کم ہی سہی مگر انگریزی کے بعض عام فہم الفاظ بھی اس طرح استعمال کیے گئے ہیں کہ ان کی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ ان تمام خداداد صلاحیتوں کے باوجود ہر بڑے شاعر کی طرح راغب بھی اپنے اظہار میں گھٹن اور تنگی محسوس کرتے ہیں۔ غالب نے اگر یہ کہا تھا کہ "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے" تو راغب یہ کہتے ہیں کہ

مرے جذبات کا اظہار نہیں ہو پاتا کچھ نئے لفظ دے یا چھین لے گویائی بھی

لب و لہجہ اور سامنے کے سادہ الفاظ کے برمحل استعمال سے معنی خیزی کا گر

راغبؔ خوب جانتے ہیں۔

؎ تم سے مجھ کو آپ تم کہنے لگو دوستی وہ دن نہ دکھائے کبھی

دائرہ در دائرہ تقسیم سب اپنا اپنا سب کو ہے سرکل پسند

لہذا کم ظرفوں پر ان کا یہ طنز غلط نہیں کہ

؎ کم نہیں زعم انہیں اپنی سخن دانی کا گفتگو کے بھی جو آداب سے ناواقف ہیں۔

شاعر کے خیال میں غزل میں دلکشی و دلبری سے زیادہ "تازگی" کی ضرورت ہے ۔اور یہ تازگی موقوف ہے کسی بڑے مقصد حیات پر مگر اس بات کو غزل کا شاعر کھلے ڈلے انداز میں نہیں بلکہ ایمائی انداز میں پیش کرتا ہے۔

غزل کے جسم میں آجائیں آپ جاں بن کر ہر ایک شعر چمک اٹھے کہکشاں بن کر

راغبؔ عام فہم محاوروں سے معنی آفرینی کا فن جانتے ہیں مثلاً ہاتھ پاؤں ہلانا، نظر بچانا، آر پار کی جنگ، پیچھے بھاگنا، ہوا دینا، آگ پانی میں لگانا، بات بڑھانا وغیرہ۔ صنعت تضاد کے ذریعہ فکر و نظر کو حسین دموڑ بنانے کا فن عہد قدیم سے جاری ہے، راغبؔ اپنے کلام میں اس بند کو بڑی چابکدستی اور کثرت سے اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

خوش ہونا وہ ترا جیتنے پر دانستہ وہ میرا ہار جانا

میں سب کا ہوں افتخار راغبؔ اک گل نے ہے مجھ کو خار جانا

یہاں ہارنے، جیتنے اور گل و خار کے علاوہ اپنے نام "افتخار" کو بھی ذو معنی انداز میں استعمال کر کے شاعر نے اس سادہ سے شعر میں معنویت کی ایک اور تہہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ شاعر الفاظ و معانی کے تعلقات میں "چرب زبانی" کا مخالف مگر جدت آفرینی کا قائل ہے۔ اب تغزل کا یہ خوبصورت سا شعر دیکھئے اور الفاظ کی جادوگری کا اندازہ کیجئے۔

؎ معلوم ہے سب لیکن تشریح نہیں ممکن

کیا بات نرالی ہے اس دشمن جانی میں

ے انکی بے مہری پہ کیوں مر نہ مٹے دل راغبؔ

دل میں رہ کر دل بے تاب سے ناواقف ہیں

ے خود کو کرتی رہی قربان درختوں پہ ہوا

سبز شاخوں کو کبھی توڑ کے اترائی بھی

ے دکھائے ان کا وہ چہرہ جو ہے پس چہرہ

نگاہ وقت کو ایسی ہے روشنی درکار

ے نہ فرق پاؤ گے کچھ میری خاکساری میں زمین بن کے ملو تم کہ آسماں بن کر

خاکساری کی یہ ادا کہ آسمان والوں کو بھی "تم" سے خطاب کر کے لطف و معنویت کو دوبالا کر دیا گیا۔ میرؔ کی زمین اور انداز میں یہ غزل نقل نہیں اصل کا لطف دینے والی ہے:

ے کیسے کہیے دل میں بس کر دل کا جو اس نے حال کیا

جب دل چاہا دل کو سنوارا جب چاہا پامال کیا

ے میں اپنے سکھ چین کا دشمن، کس کو دوشی ٹھہراؤں

اک ظلمی سے پیت لگا کر دل کو خستہ حال کیا

زبان و بیان کی قادرالکلامی اور لب و لہجہ کی دلربائی کا کمال وہاں دکھائی دیتا ہے جہاں شاعر نے غزل میں بھی مکالماتی انداز بیان اختیار کیا ہے۔

ے وہ کہتے ہیں کہ آنکھوں میں مری تصویر کس کی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ روشن اس قدر تقدیر کس کی ہے؟

وہ کہتے ہیں کہ کس نے آپ کو روکا ہے جانے سے

میں کہتا ہوں کہ میرے پاؤں میں زنجیر کس کی ہے؟

وہ کہتے ہیں کہ ہے انسان تو اک خاک کا پتلا

میں کہتا ہوں پر اتنی عظمت وتوقیر کس کی ہے؟

اسی انداز کی ایک اور غزل کے چند انمول اشعار بھی قابل توجہ ہیں۔

؎ کہا کہ آپ کو یوں ہی گمان ایسا ہے وہ بولے جی نہیں سچ مچ جہان ایسا ہے

کہا کہ آیئے بس جایئے مرے دل میں

وہ بولے آپ کے دل کا مکان ایسا ہے؟

کہا کہ پھولوں میں کیا خوب دل ربائی ہے وہ بولے کیوں نہ ہو جب باغبان ایسا ہے

اس معصومانہ مگر دلکش انداز بیان میں شاعر کی فکری پختگی اور خدا پرستانہ روش جابجا بڑے فطری انداز میں جھلکی پڑتی ہے۔ایک طرف خاک کے پتلے کو عظمت وتوقیر بخشنے والے کی یاد تو دوسری طرف پھولوں کو رنگ وروغن دینے والے باغبان کی عطا۔الفاظ کی چوپھل حقیقت کے ساتھ بحور وقوافی پر بھی فنکار کی ماہرانہ گرفت قابل توجہ ہے۔متعدد غزلوں میں جو ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

؎ ترا مشورہ ہے بجا مگر میں رکھوں گا اپنا خیال کیا

مرا دل کسی پہ ہے آگیا مرا حال ہوگا بحال کیا

؎ کیسے کہیے دل میں بس کر دل کا جو اس نے حال کیا

جب دل چاہا دل کو سنوارا، جب چاہا پامال کیا

؎ تری خوشبو مرے شعروں میں بسا کرتی ہے

شاعری قرض محبت کا ادا کرتی ہے

؎ ہاتھ رکھا تھا ہمارے دل پر اس نے ایک بار

کچھ نہیں معلوم جب سے دل ہمارا ہے کہاں ۔ وغیرہ

کلیم احمد عاجزؔ کی طرح کوئی شخص بھی افتخار راغبؔ کے کلام کو پہلی بار سن کے یقیناً چونک اٹھے گا۔اور ان کی اسبات کی تائید کرے گا کہ "ان میں فطری جوہر شاعری ہے"۔

انہیں فطری طور پر زبان وبیان اور اسلوب پر گرفت نظر آتی ہے اور یہ بہت خوش نصیبی کی بات ہے"۔ مگر فکر وفن اور زبان وبیان کی اتنی ساری خوبیوں کی بنیادی وجہ چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز ہے۔ یہیں پر مجھے کلیم احمد عاجز کی اس

رائے سے اتفاق نہیں کہ "راغب کی آواز چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز نہیں ہے"۔ ویسے وہ "جمال ہم نشیں در من اثر کرد" کے ضرور قائل ہیں۔ مگر یہ کہ کمتر درجے کی بات ہے جس شاعر نے اتنی کم عمری میں متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع کرا کے اہل نظر سے داد وتحسین حاصل کی ہو اور جو سہل ممتنع میں ایسے ایسے فنی جواہر پارے چمکانے پر قادر ہو کہ قاری بھی دل کو تھام تھام لے ایسا عام شاعروں کے بس کا نہیں۔ آخر میں چند متفرق اشعار پر اکتفا کیا جا رہا ہے:

ے

بے سہارا نہ سمجھ لے دنیا
نرم چارا نہ سمجھ لے دنیا

اپنی پلکوں سے اٹھاؤں تجھ کو
میں تو آنکھوں میں بساؤں تجھ کو

روٹھنا مت کہ منانا نہیں آتا مجھ کو
پیار آتا ہے، جتانا نہیں آتا مجھ کو

ترا چہرہ ہے دل کے آئینے میں
بہت محفوظ ہے تو حافظے میں

مت مجھے مہر و مہ دیجئے
چلنے پھرنے کو رہ دیجئے

آئینے کے ہیں وہ روبرو
ان کو میری نگہ دیجئے

قرۃ العین حیدر۔ اردو فکشن کی ایک منفرد فنکار

فنکار خواہ کسی زبان و ادب، فکر و نظر، صنف و ہیئت اور ملک و ملت کا ہو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر وہ حسن، خیر اور صداقت ہی کا متلاشی ہوتا ہے۔ اس تلاش میں اسکی انفرادیت کا ایک پیمانہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ ادب و تخلیق کی تین بنیادی شرطوں پر اس کی تخلیقات کی جانچ اور پرکھ کی جائے۔ یعنی اولاً موضوع یا فکر کی اہمیت دوم جمالیاتی طرز اظہار اور سوئم ہیئت کی عمدہ ترکیب، ایک اور کارگر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس فنکار کے ہمفکر، ہمعصر یا ہم مرتبہ فنکاروں سے اس کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پریم چند کے بعد اردو فکشن میں دوسرا سب سے بڑا اور منفرد نام و مقام قرۃ العین حیدر کا ہے۔ پریم چند نے فکری طور پر ہندوستان کی غریب اور دیہی آبادی کے مسائل و مصائب اور جد و جہد آزادی کو اگر اپنا موضوع بنایا تو قرۃ العین حیدر نے شہروں کی خوشحال، اعلیٰ تعلیمیافتہ، مغرب پسند اور تقسیم ملک کی ماری اور ستائی ہوئی آبادی کو اپنا ہدف بنایا۔ فنی اعتبار سے پریم چند نے اردو فکشن کو داستانی اور تخیلی بھول بھلیوں سے نکال کے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کی پیشکش کے لئے ملک کی مقبول و محبوب عوامی یا ہندوستانی زبان اردو کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا تو قرۃ العین حیدر نے اپنے وسعت مطالعہ، دانشوری اور اختراعی صلاحیت سے اردو فکشن کو جدید تخلیقی رویوں سے آشنا کیا اور قارئین کو خودشناسی اور زمانہ شناسی سے ہوتے ہوئے خداشناسی کی طرف متوجہ کیا۔

علمی اور ادبی اعتبار سے قرۃ العین حیدر کی حیثیت مختلف الجہات رہی وہ بیک وقت اردو انگریزی کی صحافی، دانشور، پروفیسر، مترجم اور اردو کی فکشن نگار تھیں۔ ان میں سے بعض میدانوں میں وہ بڑے سے بڑے انعامات سے نوازی بھی گئیں۔ "میرے بھی صنم

خانے" سے "آخر شب کے ہمسفر" اور پت جھڑ کی آواز سے کار جہاں دراز ہے" تک ان کا تخلیقی سفر نئی سے نئی بلندیوں کو چھوتا رہا۔ خاص کر "آگ کا دریا" سے دنیائے ادب میں ان کے نام کی دھوم مچتی رہی۔ ان کے فکر وفن پر درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔ انہیں اردو فکشن میں نئے نئے رجحانات کی بانی (Trend Setter) اور پریم چند کے بعد عہد آفریں شخصیت (Epoch Making) تسلیم کرلیا گیا۔ "آگ کا دریا" میں کوتم نیلمبر، ہری شنکر اور کمال الدین اور کوتم کو جنم جنم کا ساتھی دکھایا گیا ہے ان چاروں کے حوالے سے "شعور کی رو" (Stream Of Conciousness) یا چشمہ خیال کے ذریعہ مہاتما بدھ سے لے کر تقسیم ملک تک، بودھی، ہندو، مسلم اور انگریزی تاریخ وتہذیب اور فلسفہ وتصوف نے جو کروٹیں لی ہیں ان کا تخلیقی اظہار بھی کیا گیا ہے قرۃ العین حیدر سے پہلے سجاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات" (ناولٹ) کے ذریعہ تلازمہ خیال (Free Association Of Thought) کی تکنیک کا اردو فکشن میں کامیاب تجربے کا آغاز کیا مگر اس ابتدائی کوشش کو قرۃ العین حیدر نے آگ کے دریا میں بڑی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس کا موازنہ جیمس جوائس کے "یولی سیز" (Ulysses) سے کیا جائے "دونوں جگہ شعور کی رو" مشاہدۂ نفس اور درون بینی تو ضرور پائی جاتی ہے مگر قرۃ العین حیدر کی جہاں بینی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ داستان کسی شخص کی نہیں بلکہ اس برصغیر (Sub Continent) کے پورے معاشرے اور اس کی تاریخی کروٹوں کی ہے۔ وقت کا تصور بھی قرۃ العین حیدر کے یہاں جیمس جوائس کے مقابلے میں وسیع تر جامع تر اور واضح تر ہے۔ غرض زمان ومکان اور باطنی مشاہدے کے ساتھ خارجی مشاہدے کے اعتبار سے بھی قرۃ العین حیدر کو جیمس جوائس پر فوقیت حاصل ہے۔ جیمس جوائس کی فنی ناکامی کا ایک اور ثبوت اس کا ناکام تجزیاتی ناول "فینے گینس ویک" (Finnegans Wake) ہے، جس کے بارے میں ناقدین کی رائے یہ ہے کہ "ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

''جبکہ آگ کے دریا کے بعد قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' کے بارے میں بیشتر ناقدین کا خیال یہ ہے کہ فنی اعتبار سے آگ کا دریا زیادہ گٹھا ہوا اور کامیاب تجربہ ہے۔اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے قصہ نگاری اور ماجرا سازی میں متعدد تجربات کے باوجود اردو فکشن کو ثروت مند بنانے میں اہم ترین رول ادا کیا ہے۔اس فن میں قرۃ العین حیدر کے کارنامے بھی ناقابل فراموش ہیں۔

اسی طرح ایک باکمال خاتون مغرب ورجینا وولف کے مندرجہ ذیل ناولوں سے بھی تقابلی مطالعہ خیال انگیز اور دلچسپ ہوسکتا ہے:۔

(1)The voyage oun (1915) (2)Night and Day (1919) (3)Mrs.Dallowy(1925) (4)The Light House(1927) (5)Orlando (1928) (6)The waves (1931)وغیرہ اس میں کوئی شک نہیں انہوں نے الفاظ کے استعمال میں جزرسی کے باوجود کرداروں کے لطیف ترین نفسیات اور مختلف مواقع کے نازک ترین حساسات کی تصویر کشی کا کمال مظاہرہ کیا ہے قرۃ العین حیدر نے ان سے خوب استفادہ کیا۔یوں ہر بات کی تہہ تک پہنچنا اور حیات کے ہر مظہر کے اسرار ورموز کا سراغ لگانا دونوں کے یہاں زمانی ومکانی فرق کے ساتھ خوب ملتا ہے۔نسائیت کی چھٹی حس پر حسب موقع انگلی رکھنے کے سلیقے میں بھی دونوں کا امتیاز واضح ہے۔لیکن قرۃ العین حیدر کی نکتہ وری،ذہانت وجامعیت کے ساتھ صوفیانہ تخیل کی پرپرواز قابل ذکر ہے۔وہ اپنے فکشن میں تعقل کے ذریعہ ماجرا سازی،تاریخ نویسی اور سوانح نگاری میں نئی جان ڈال دیتی ہیں۔

اسی طرح قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''سیتاہرن'' کا تقابلی مطالعہ ''دی ویمن آف روم''(The women of Rome)اطالوی ناول نگار ٹومورادیا کے ناول سے کیا جا سکتا ہے''سیتاہرن'' دراصل جدید تہذیب کی پروردہ ایک ہندوستانی عورت ڈاکٹر سیتامیر

چندانی کی بے کسی، وبے راہ روی اور بے بسی کی ویسی ہی تصویر بلکہ اس سے بھی زیادہ المناک داستان ہے جیسی اطالوی ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ تہذیبی وعصری حسیات اور مواد حیات، سیتاہرن میں ''دی وومن آف روم'' سے زیادہ ہے۔ اتنا ہی نہیں اردو ناول میں عریانی کم اور شائستگی زیادہ ہے، جبکہ اطالوی ناول میں مبالغہ آمیز حقیقت پسندی اور فطرت نگاری کے نام پر شائستگی کی بہت کمی ہی نہیں بلکہ عریانی کی زیادتی نے بہیمیت اور وحشت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ مغربی مذاق فن میں ممکن ہے اطالوی ناول کی فحاشی پسندیدہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں ٹومورادیا کے ناول سے زیادہ قدر جمال اور قدر اخلاق ہے تمام واقعات کے باوجود ''سیتاہرن'' کی ہیروئن سے ہمیں ہمدردی ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے عرفان جیسے بہت پڑھے لکھے اور بظاہر نہایت شائستہ ہیرو کو ہم ایک وحشی ویلن سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر وہ ہمدردی ''دی وومن آف روم'' کی ہیروئن کے ساتھ محسوس نہیں ہوتی صرف اس پر ترس آتا ہے اور اس کے معاشرے پر غصہ آتا ہے۔

تقابلی مطالعے کی ایک اور جہت تقسیم ملک کا کرب اور اس کے عواقب ونتائج ہیں قرۃ العین حیدر کے متعدد افسانوں اور ناولٹ کے علاوہ ''آگ کا دریا، سیتاہرن، آخر شب کے ہم سفر، جلاوطن، فصل گل آئے یا اجل آئے'' وغیرہ کا تقابلی مطالعہ، حیات اللہ انصاری کے پانچ جلدوں میں لکھے گئے بھاری بھر کم ناول ''لہو کے پھول'' شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' احسن فاروقی کا ''شام اودھ'' انتظار حسین کی تخلیقات، ڈاکٹر قاضی عبدالستار کا ''شب گزیدہ، خدیجہ مستور کا'' ''آنگن'' وغیرہ نے اس برصغیر کی تقسیم در تقسیم کے درد مسلسل کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے، سوال یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے تصور تخلیق

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور دیگر ناول نگاروں کے اس نقطۂ نظر میں کیا بنیادی فرق ہے ؟

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش صاحبو اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

قرۃ العین حیدر کے مطالعہ کی ایک اور جہت فن کے ساتھ ان کے فکر کی جامعیت اور اس کی نوعیت ہے۔ ان کا کوئی متعین فکر اور نصب العین تھا بھی یا نہیں ؟ اگر نہیں تو کیا ان کے تعقل میں ایک آنچ کی کمی تھی یا ذہن کا کوئی گوشہ خالی تھا ؟ کیا ان کا تفکر قدرے تحقق کے باوجود کسی فلسفیانہ بنیاد کا حامل تھا ؟ موصوفہ نے جابجا تصوف کی حمایت اور افادیت کو واضح کیا ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے۔ اپنے فکشن میں تمام افکار کے باوصف وہ علامہ اقبال اور برنارڈ شا کی طرح مفکر فنکار کیوں نہیں بن پائیں۔ یہ ان کے لیے مفید رہا یا مضر، غور طلب ہے۔

گوتم نیلمبر آغاز داستان میں فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے مگر انجام قصہ میں وہ ایک معمولی سرکاری ملازم کی شکل میں نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر شاید اپنے ذوق ہمہ گیری، مصوری۔ تاریخیت اور تہذیبی سحر کاری میں محور ہیں اور یہ ان کی ناول نگاری کے لیے زیادہ سودمند رہا۔ شاید اسی لیے وہ "کار جہاں دراز" ہے جیسی سوانحی تاریخی داستان سرائی میں کامیاب رہیں۔ موصوفہ نے اپنی بیشتر تخلیقات میں دور جدید کے معاشی و سیاسی استحصال کے ساتھ ہی ساتھ جنسی و معاشرتی استحصال اور نسائیت کی توہین کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سیتاہرن کی ہیروئن ڈاکٹر سیتا میرچندانی کی شکل میں نئی عورت کا المیہ ہے، یہ ایک جدید تعلیمیافتہ سندھی ہندو رفیوجی خاتون ہیں جو اپنے وقت کی علامتی سیتا ہیں اور جو زندگی کی لڑائی ہار گئی ہیں، زمانے کے راونوں کے وہ ہاتھ لگ گئیں جن میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، انہیں تقسیم ہند کی سرحد کے دونوں طرف کہیں قرار نہیں نہ ہندوستان میں نہ پاکستان میں، نہ ہندو معاشرہ ان کو راس آتا ہے، نہ مسلم معاشرہ۔ ان دونوں ملکوں سے باہر بھی انہوں نے قسمت آزمائی کی مگر کوئی

جائے پناہ نہ ملی کوئی مرد ان کے ساتھ وفا نہیں کرتا نہ وہ کسی مرد کے ساتھ وفا کرتی ہیں۔غرض وہ ایک بے وفا تمدن کی پیداوار اور ایک بے کردار تہذیب کی مخلوق نظر آتی ہیں۔اسی طرح ہر جگہ وہ لرزہ خیز واقعات کی فنکارانہ تصویر کشی کر کے بالواسطہ طور پر خودشناسی، زمانہ شناسی اور خداشناسی کی طرف اشارے تو کرتی ہیں مگر عصر حاضر کی مادہ پرست اور یکرخی تہذیب کی مضمر خرابیوں کے ازالہ کی کوئی ترکیب بتا نہیں پاتیں انہوں نے عصر حاضر کی

کائناتی لوٹ کھسوٹ اور جدید سرمایہ دارانہ سودی نظام کے نتیجے میں غربت وامارت کی بڑھتی ہوئی خلیج کا بہتوں سے زیادہ گہرا مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا،اب تو گلوبلائزیشن کے ساتھ گلوبل وارمنگ علمی دھماکے کے ساتھ کارپوریٹ کلچر کے دھماکے نے خدا، کائنات اور انسان کے تینوں بنیادی رشتوں کے توازن ہی کو نہیں بگاڑا بلکہ خود انسانی رشتوں کی تینوں جہتوں کو بھی تباہ وبرباد کر کے رکھدیا ہے یعنی مرد کا تعلق عورت سے،مرد کا تعلق مرد سے اور فرد کا تعلق اس کے اپنے نفس سے۔ان تینوں رشتوں کے بحران نے انسانی حقوق کی عالمگیر پامالی کی وجہ سے ہر شخص آج یہ سوال کر رہا ہے کہ اس پر تشدد، ظالمانہ اور تہلکہ خیز سماج میں فروغ وار تقا کے کام کو کیسے جاری رکھا جاسکتا ہے؟موجودہ صورت حال پر مہاتما گاندھی نے اسی لیے ایک بار کہا تھا کہ

> ''دنیا کے پاس تمام لوگوں کو کھلانے کے لیے کافی ہے،مگر لوگوں کی ہوس کو بجھانے کے لیے بالکل ناکافی ہے''

قرۃالعین حیدر نے اپنی تخلیقات میں تکثیری سماج قومی یکجہتی اور حقوق انسانی کی پامالی کی دل دہلا دینے والی تصویریں پیش کی ہیں لیکن ان کے علاج کی نشاندہی سے وہ معذور ہیں۔ بہر حال تخلیق وتحقیق اور فکروفن کے حسین امتزاج سے جو کارنامے انہوں نے پیش کیے انہیں اردو ہی نہیں عالمی ادب میں بیش بہا اضافہ کہا جائے گا۔آج کے ناقدین ومحققین کی ذمہ

داری ہے کہ وہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقی انفرادیت اور اسکی قدر و قیمت کو واضح کرنے کے لیے مذکورہ تقابلی نکات کو بھی پیش نظر رکھیں ان کی جگر کاوی پر یہ اشعار صادق آتے ہیں کہ ۔

کہاں ملے گی اب ایسے خلوص کی پیکر پرانے دور کی تہذیب کا نشان تھی وہ
وہ ایک باب تھی تاریخ عہد ماضی کا بہت سی قدروں کی یادوں کی ترجمان تھی وہ

پروفیسر شارب ردولوی کا تنقیدی شعور
(''اسرارالحق مجاز'' کی روشنی میں)

ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر پروفیسر شارب ردولوی نے پچھلے سال (۲۰۰۹ء) مجاز کی زندگی اور شاعری پر ایک مونوگراف شائع کروایا جو بمشکل ڈیڑھ سو صفحے پر مشتمل ہے مگر اسے کسی اہم شاعر یا فنکار کے فکر وفن پر جدید تنقید و تحقیق کی روشنی میں جامع ترین ادبی تعارف کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ تنقید اگر کسی فن یا فنکار کی جانچ اور پرکھ کا نام ہے تو یہ ''جانچ اور پرکھ'' معتبر تحقیقی مواد کے بغیر ممکن نہیں۔ زیر نظر تصنیف بظاہر محض تین ابواب پر مشتمل ہے یعنی'' حیات اور شخصیت، فن اور انتخاب کلام'' مگر اس کتاب کا قاری مجاز کی زندگی (۴۴ سال) اور شاعری کے تقریباً (۲۵ سال) ہر پہلو پر اہم ترین معلومات سے واقف ہو جاتا ہے۔ بجہ ظاہر ہے مصنف نہ صرف یہ کہ مجاز کے ہم وطن (ردولی) ہیں بلکہ ان کا شمار اردو کے معتبر نقادوں میں ہوتا ہے، جن کی درجنوں تنقیدی و تحقیقی تصانیف پر برصغیر ہند و پاک کے ادبی اداروں نے اعزازات وانعامات سے نوازا ہے، بالفاظ دیگر نصف صدی سے زاید علمی و ادبی مطالعہ و تحقیق کے ریاض کے بعد مصنف نے جب اپنے ہم فکر اور ہم وطن شاعر پر قلم اٹھا یا تو پوری ادبی غیر جانبداری کے ساتھ اپنا حاصل مطالعہ مدلل و تحقیقی انداز میں پیش کر دیا۔ اس لیے یہ کتاب معیاری تحقیق وتنقید کے حسین امتزاج کا ایک عمدہ نمونہ کہے جانے کی مستحق ہے۔ موصوف نے پیش لفظ میں بجا طور پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اردو کے بیشتر شعرا اور ادبا کی طرح مجاز کے بارے میں بھی باقاعدہ ''دستاویز سازی'' نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے متعدد دشواریوں کے باوجود حتی الوسعی مجاز کی زندگی اور فن سے متعلق کئی غلط فہمیوں کا مدلل ازالہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ان کی شراب خوری، پیسے کی کمزوری، سستی رومانیت یا سطحی انقلابی

شاعری کے سلسلے میں بعض لوگوں نے جس مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے ایک دیانتدار ناقد اور منصف مزاج محقق کی حیثیت سے مجاز کی کمزوریوں کا اعتراف کے باوجود خاندانی پس منظر، تہذیبی اقدار اور افتادِ طبع کے علاوہ ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں واقعاتی مثالوں کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ مجاز نے "کبھی ہوش میں شراب کے لیے پیسے مانگے نہ بے ہوشی میں کوئی مطالبہ کیا" (صفحہ: 67)۔ وہ حفظ مراتب کا بے حد خیال رکھتے، ان کی جیب میں پیسے ہوتے تو کافی کے پیسے خود ادا کرنے کی کوشش کرتے، ضبطِ نفس کا یہ حال کہ کبھی کسی کو برا بھلا نہیں کہا متعدد جذباتی موقعوں پر بھی خاموشی سے کام لیتے یہاں تک کہ رومان اور عشق و عاشقی میں یک طرفہ عشق کر کے اپنی جان پر بھی کھیل گئے مگر نہ کہیں کھل کھیلے نہ کسی کی پگڑی اچھالی۔ جوش ملیح آبادی نے ایک طویل نظم "پندنامہ برائے اصلاح مجاز" کے عنوان سے لکھی جس سے مجاز کو سخت تکلیف پہنچی، جواباً انہوں نے صرف دو قطعات لکھے۔ انہوں نے "کبھی کسی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا" (63 صفحہ)، البتہ دیوانگی کے عالم میں کبھی کبھی اپنا نام غالب اور اقبال کے ساتھ لکھا۔ ایک زمانے میں انہوں نے شراب خوری پر قابو پانے کی بھی کوشش کی مگر بعض مشاعروں، نشہ بازوں کی صحبت اور چھوٹی جگہوں کے پینے والوں کے ساتھ خراب اور سستی شراب پی کر ان کی صحت کو ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ تین بار جنون کے دورے پڑے آخری دورے کے بعد رانچی مینٹل اسپتال میں بھی سہیل عظیم آبادی کے مخلصانہ تعاون سے ڈاکٹر ڈیوس کے زیر علاج رہے اور تندرست ہو کے واپس ہوئے۔ مگر صفیہ اختر (بہن) کے انتقال کے بعد مختلف شاعروں میں میخوار شعرا کی صحبت نے صحت خراب کر دی۔ مصنف ان دنوں (۱۹۵۳ تا ۱۹۶۰ء) لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم اور ریسرچ اسکالر تھے۔ مجاز سے رشتہ داری، ان کے چچا زاد بھائی رضا حسین کے مجاز بچپن کے ساتھیوں میں تھے اس لیے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وفات (۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء رات میں ۱۰ بج کر ۲۲ منٹ) سے پہلے مجاز کو ۳ر دسمبر کے اسٹوڈنٹس اردو کنونشن میں

مدعو کیا گیا، جس میں اس زمانے کے اکابر ادبا و شعرا کے علاوہ ترقی پسند تحریک کی دو نسلوں کے مشاہیر ادب بھی شریک ہوئے آخر نصف شب کے قریب مشاعرے میں مجازؔ کا نام پکارا گیا تو پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا لوگوں نے اصرار کر کے دو تین غزلیں پڑھوائیں ۔اس موقع سے دو اشعار کا مصنف نے حوالہ بھی دیا ہے:

بڑی مشکل ہے دنیا کا سنورنا   تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

اور مجازؔ اس شعر کو بار بار پڑھتے رہے

یہ اپنی سیلِ غم و سیلِ حوادث   مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

دوسرے روز ۴ دسمبر کو تقریباً ساڑھے نو بجے شب میں مجازؔ کی طلبی پر مصنف سنگم ریسٹورنٹ کے قریب انہیں لینے پہنچے تو شومئی قسمت اسی وقت ایک رکشے سے ان کے پرانے میخوار احباب بھی آگئے شارب صاحب کے روکنے کے باوجود وہ بے تحاشا دوڑے اور اسی رکشہ سے لال باغ کے ایک گھٹیا قسم کے شراب خانے کا رخ کیا مجازؔ کے لفظوں میں اسے ''لاری کی چھت'' کہا جاتا تھا اسی جاڑے کی شب وہ چھت پر بیہوش پائے گئے ۔وہاں سے بلرام پور اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں لائے گئے ۔جہاں دوسری رات مجازؔ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یوں مصنف نے بہت قریب اور دقت نظری کے ساتھ مجازؔ کی زندگی کے مختلف مگر اہم مراحل کی تفصیل پوری سوانحی دیانتداری کے ساتھ پیش کردی ہے۔مصنف نے مجازؔ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور فکر و فن کی اٹھان کے حقائق کو کمال اختصار کے ساتھ ''تہذیبی اقدار'' اور ''خاندانی پس منظر'' کے علاوہ ان کے بچپن، تعلیم، ملازمت، عشق اور جنون وغیرہ کے احوال کو معتبر حوالوں سے پیش کیا ہے۔مصنف نے آغاز ہی میں ایک اہم تاریخی حقیقت کو واضح کیا ہے جسے ہم عرف عام میں گنگا جمنی تہذیب بھی کہتے ہیں تقریباً ہزار سالہ مسلم صوفیا، تاجر اور سپاہیوں کی آمد و رفت اور خلا ملا سے نہ صرف یہ کہ ملک گیر پیمانے پر ایک مشترکہ ہندوستانی کلچر فروغ پذیر ہوا بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبات میں جہاں درباری امرا

اور صوبے داروں کی عیش کوشی چال بازی اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خاندانی روایات، ایمانداری اور راست بازی، بالعموم غیر متاثر رہتی تھی اسی لیے یہاں کی سرزمین عمدہ لوگوں کو پیدا کرنے کے لیے مناسب تھی، مصنف نے مشہور مورخ مشیر الحسن کی ایک معروف کتاب (''اتحاد سے انتشار کی طرف: کلونیل عہد کے قصبات'') کے حوالے سے اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ ردولی (شریف) دیسنہ بہار شریف، پھلواری شریف وغیرہ جیسے قصبات ہی ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کے اصل میدان تھے:

''یہ قصبات ہی تھے جہاں شعر و شاعری، ادب اور موسیقی نے نمو پائی اور یہی قصبات تھے جہاں تہذیبوں کو امتزاج باہم کے مواقع فراہم ہوئے''

اور جہاں ''ایک خاص طرح کے کلچر مذہبی رواداری اور مشترکہ تہذیب کو فروغ'' نصیب ہوا۔ اس ماحول میں پرورش و پرداخت کے بعد مجاز جب سن شعور کو پہنچے تو تعلیمی سلسلے میں آگرہ اور علی گڑھ سے فیضیاب ہوئے جہاں، فانی بدایونی، میکش اکبر آبادی اور حامد حسن قادری جیسے لوگوں کی سرپرستی اور جذبی و آل احمد سرور جیسوں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت نے مجاز کے اندر کے شاعر کو بیدار کر دیا۔ مجاز کے والد بزرگوار کا تبادلہ آگرہ سے علی گڑھ ہو گیا تو مجاز بھی یہاں آ گئے۔ علی گڑھ ان دنوں نئے اور انقلابی خیالات کا مرکز تھا، جہاں ڈاکٹر محمد اشرف، اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، سردار جعفری کی صحبت اور آزادی، ترقی، تبدیلی اور انقلاب کے ساتھ سرخ سویرے کا چرچا تھا۔ جہاں رومانیت اور انقلاب گلے مل رہے تھے۔ غرض اس ماحول نے مجاز کے فکر و فن کو یہاں پوری طرح ابھار دیا اسی لیے مصنف کا یہ خیال بجا ہے کہ:

''مجاز کی شاعری کی ابتدا کہیں بھی ہوئی ہو لیکن ان کی اصل شعری زندگی ان کے علی گڑھ کے قیام سے شروع ہوئی'' (صفحہ: 78)

تقریباً ساٹھ صفحات کے اس منظر و پس منظر کی پیشکش کے بعد مصنف نے پچاس صفحات

میں مجاز کے فن کے انقلابی، رومانی، غنائی اور غزلیہ شاعری کے مطالعہ وتجزیہ کے بعد ان کی ادبی اہمیت کو واضح کیا ہے۔اس ضمن میں فیض کے مفروضے ''شمشیر، ساز اور جام'' بحوالہ

؎ دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

کے علاوہ بعضوں کے علاقائی مفروضوں یعنی آگرہ، علی گڑھ، دہلی اور لکھنؤ کے قیام میں ان کی شاعری کے عناصر ترکیبی کو بنیادی حیثیت دی ہے جن کے جزوی اثرات کو تسلیم کرنے کے باوجود مصنف نے اختلاف کیا ہے اور اپنے مطالعہ وتجزیہ کو مدلل انداز میں پیش کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ غنائی شاعری اور سیاسی شاعری ان کے تخلیقی سفر کی دو اہم منزلیں ہیں، چنانچہ ''ان کی بیشتر نظموں میں دونوں پہلو موج تہہ نشیں کی شکل میں موجود ہیں'' (صفحہ:80) ناقد کے خیال میں مجاز نے زندگی اور اس کے تضادات کو بہت قریب سے دیکھا، اور بڑے چرکے بھی کھائے مگر ان کے بیدار فکری رویے اور کلاسیکی ذہنی تربیت نے انھیں ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔اور نہ ان کی غنائی شاعری کو مجروح ہونے دیا اسی لیے وہ مجاز کی ''انقلابی رومانیت'' کے قائل ہیں۔

مصنف نے تفصیلی تجزیے کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں، ناوقت موت، نامساعد حالات اور بار بار دیوانگی کے حملوں کے سبب ان کا شعری اثاثہ سب سے کم ہے مگر مسلسل ''ذہنی، جذباتی اور معاشی صدمات کے باوجود مجاز کے کلام کی تازگی کبھی کم نہیں ہوئی'' (صفحہ:81) مزید یہ کہ اس ''اختصار کے باوجود مجاز اپنے زمانے میں سب سے زیادہ سربلند اور مقبول شاعر تھے'' (صفحہ:82) اس مقبولیت کا راز ان کی بعض بے اعتدالیوں کے باوجود ان کی سلامتی طبع، جمالیاتی انبساط، کیف آوری اور اثر آفرینی میں پوشیدہ ہے۔فکری اعتبار سے ترقی پسندی، یورپ میں فاشزم کی بڑھتی ہوئی لہر ملک میں آزادی کی تحریک اور دوسری جنگ عظیم نے ماحول میں سیاسی شوریدگی اور برہمی بھر دی تھی جس کا اظہار جوش، سردار جعفری، کیفی اور نیاز حیدر وغیرہ کے یہاں دیکھا جاسکتا

ہے۔مجاز کی اس اعتدال پسندی اور غلبہ غنایت کی وجہ ناقد کے خیال میں

''ان کی ذہنی تربیت ایک ایسے سماجی اور تہذیبی ماحول میں ہوئی جہاں زور سے بولنا اور بہ آواز ہنسنا بھی خلاف ادب نہیں تھا بلکہ جوش و ناکواری کا اظہار بھی تہذیب کے حدود میں ہی ممکن تھا، یہ تربیت ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی'' (صفحہ: 81)

اسی لیے ان کی سیاسی یا انقلابی شاعری میں بھی چند نظموں کو چھوڑ کر بلند آہنگی نہیں ملتی۔ان کی مشہور نظم ''آہنگ نو'' کو ناقد نے ایک ''نیا رزمیہ'' سے تعبیر کیا ہے، جس میں تباہی اور خوں ریزی کے بجائے تعمیر کا جذبہ پوشیدہ ہے۔شاعر ''جوانان وطن'' سے مخاطب ہے اور انہیں انقلاب نو کے لیے بیدار کرتا ہے۔

؎ دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنت کر دو

تم ہو عزت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں، احساس تمہیں ہے کہ نہیں

موصوف نے مجاز کی مختلف سیاسی و انقلابی نظموں کا جوش اور دوسرے شاعروں کی نظموں سے تقابلی مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ''جوش لفظ کے خالق تھے اور مجاز لفظ کے نبض شناس (صفحہ: 91)، ان کے الفاظ اور تراکیب میں جو تخلیقی استعمال ہے وہ دوسروں کے یہاں کمیاب ہے، وہ ''خار زار جہاں'' میں گلاب پیدا کرنے کا پیغام دیتے ہیں اور ''نوجوان خاتون سے'' میں ''آنچل کو پرچم'' بنا لینے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔وہ ''انقلاب اور آزادی'' کی جنگ میں عورت کو برابر کا شریک اور مرد کا ہم دوش بنانا چاہتے ہیں۔اپنی مشہور زمانہ نظم ''آوارہ'' میں نوجوانوں کو محبت سے انقلاب تک کے سفر کے لیے تیار کرنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں (صفحہ: 93) اسی وجہ سے مصنف ''خواب سحر'' کو مجاز کی شاعری میں ''فکری ارتقا'' کی طرف ایک قدم بتاتے ہیں۔وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مجاز نہ

سیاست داں ہیں، نہ فلسفی، اور نہ نظریہ ساز اور نہ نظریہ سازی شاعر کا کام ہے وہ بنیادی طور پر ایک بیدار ذہن اور بیدار فکر شاعر ہیں (صفحہ:89) ویسے اس کتاب کا قاری یہ سوال کر سکتا ہے کہ بیشک نظریہ سازی شاعر کا کام نہیں مگر بعض عظیم شاعروں میں رومی اور اقبال نے اگر نظریہ سازی کا بھی کام کیا تو اس سے ان کی شاعری میں کوئی کمی واقع ہوگئی۔

آل احمد سرور مجاز کو ''رومانیت کا شہید'' کہتے ہیں تو کوئی ''انقلاب کا نغمہ خواں'' پروفیسر شارب ردولوی انہیں بنیادی طور پر ایک غنائی شاعر مانتے ہیں۔ ''عشقیہ و غنائی شاعری'' کے زیر عنوان مصنف نے سچ کہا ہے کہ ''مجاز تقاضہ دل اور تقاضائے زندگی دونوں کے شاعر ہیں'' (صفحہ:99) انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ بالعموم عام شعرا کے یہاں رومانی اور انقلابی کی الگ الگ دو سطحیں نظر آتی ہیں لیکن مجاز کے یہاں دو تین نظموں کو چھوڑ کر یہ دونوں ہی جذبے اس طرح ایک دوسرے سے مل گئے ہیں کہ انہیں الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ ''جذبۂ دل'' کے ساتھ ہی ''حالات زمانہ'' کے مطالبات کے تحت انقلاب کی زمزمہ خوانی کرتے ہیں، چنانچہ دور اول (قیام آگرہ) ہی سے ان کے ابتدائی کلام میں زبان کی پختگی اور خیال کی گہرائی ان کے قارئین کو چونکاتی ہے مگر ان کی اصل رومانی یا عشقیہ شاعری کا عہد ان کے قیام علی گڑھ سے شروع ہوتا ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری مشہور زمانہ ہے۔ مگر مجاز کا محبوب اختر شیرانی کی سلمیٰ یا حسرت موہانی کی بنت عم یا کلاسیکی اردو سے بہت مختلف، کارزار حیات میں ان کا ہمدوش ہے۔ مصنف کی تحقیق کی رو سے مجاز کی پہلی رومانی نظم ''نمائش'' (1931) ہے جس نے علی گڑھ میں انہیں ہر دلعزیز بنا دیا۔ ''نذر خالدہ'' مجاز کی مشہور رومانی نظم مانی جاتی ہے جس کی منجھی ہوئی زبان اور تراشیدہ انداز نے عجب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ مصنف نے مجاز کی رومانی شاعری کی تین خصوصیات پر بطور خاص زور دیا ہے۔ اول جذبات نگاری، دوسرے پیکر تراشی و تصویر کشی اور تہذب عاشقی اور تیسرے موج تہ نشیں کی طرح ان کا خلوص، سادگی اور معصومیت۔ کلاسیکی عاشق اور معشوق عام طور پر ظالم و

مظلوم کی طرح آج غیر فطری معلوم ہوتے ہیں ،مجاز نے اپنے محبوب کو دوست ،ہمدرد اور دلساز کا درجہ دیا ہے،اسے اپنے برابر کا شریک بنا کر طوفان حوادث سے لڑ جانے کا عزم سکھایا ۔

؎ دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرائتیں اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

ناقد نے مجاز کی ہر نظم کا بڑی بالغ نظری اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اسی لئے اخذ نتائج میں ان سے شاید ہی چوک ہوئی ہو۔چونکہ ان کی پوری عمر نقد و تحقیق اور مطالعہ و محاسبہ میں گزری ہے اس لئے مجاز سے ہمدردی اور قربت کے باوجود بے جا پاسداری اور مبالغہ آرائی سے انہوں نے کہیں کام نہیں لیا ہے۔ایک اچھے نقاد کی صفات میں جہاں گہرے اور وسیع مطالعہ کو ضروری سمجھا جاتا ہے وہیں اس کی غیر جانبداری نکتہ آفرینی اور ژرف نگاہی کی اہمیت بھی مسلم ہے زیر مطالعہ چھوٹی سی تصنیف میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ "جدید اردو تنقید ،اصول و نظریات"، "تنقیدی مباحث" اور "تنقیدی مطالعے" میں برسوں جو نظری و تحقیقی جگر کاوی کی گئی ہے اس کی عملی تعبیر و تطبیق "اسرار الحق مجاز" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مصنف نے مدلل انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ مومن اور حسرت کی رومانی روایت کو یقینا مجاز نے آگے بڑھا کے اپنے زمانے کی عورت سے عشق کیا جس کے یہاں محبت ،چارہ گری اور چارہ سازی کا پہلو بھی نمایاں ہے، ملاحظہ ہو ان کی نظمیں "عیادت، مادام ،آج بھی اور اعتراف" وغیرہ۔خود کہتے ہیں کہ ع میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے

نظم "اعتراف" کو مصنف کے لفظوں میں منظوم "خودنوشت" کہا جا سکتا ہے،ان کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں مجاز لکھنؤ میں تھے اور "اسی زمانے میں ان کی ملاقات انھیں خاتون سے ہوئی جو ان کی بیماریٔ دل کا سبب تھیں"۔اب ان کی تنقید ملاحظہ ہو کہ یہ ایسی خودنوشت" ہے

جسے پوری ایمانداری اور احتیاط سے لکھا گیا ہو "جس میں ایک ایسے کرب، بے بسی اور بے چارگی کا بیان ہے جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا" (۱۰۹ صفحہ) پوری نظم خوبصورت "تراکیب اور تراشیدہ موثر الفاظ سے موضوع کے تضاد کو ابھار کر زیادہ اثر انگیز بنانے کا کام لیا گیا ہے۔ ناقد نے شاعر کے مصرع "ریگ کو سلسلۂ آب رواں جانا تھا" کی نہایت لطیف اور حسین وضاحت کرتے ہوئے سچ کہا ہے کہ "مجاز الفاظ کے استعمال میں بھی غیر شعوری طور پر بے حد محتاط ہیں" (صفحہ:۱۱۱) "نذر علی گڑھ" کے بارے میں ناقد کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک عجیب انداز کی نظم ہے، جس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا ترانہ بنا کر سب سے بڑا اندرانہ عقیدت پیش کیا ہے، جس میں جوانی کی شورش، بغاوت، اور حسن کی دلنوازی اور عشق کی کرشمہ سازی بھی ہے۔ مزید یہ کہ فنی اعتبار سے الفاظ کا دروبست خیال کی رعنائی اور مصرعوں کی روانی نے اس کے اندر ایسی زندگی بھر دی ہے کہ ہر چیز زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا، ہر قصر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا۔

عنایت سے لبریز، ادارے سے حد درجہ عقیدت، حسن کاری اور الفاظ کی بُنت نے بلاشبہ پوری نظم کو ایک فکر انگیز ناثر میں ڈھال دیا ہے۔

مجاز کے مجموعہ کلام میں تقریباً ۴۳ غزلیں ہیں، ناقد کے خیال میں ان کی بعض نظمیں بھی غزل نما ہیں، کمیت سے صرف نظر کیجئے تو ان غزلوں کی کیفیت، اردو غزل کے سرمایہ میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف نے بعض نظموں کے اشعار کا حوالہ دیکر

یہ ثابت کیا ہے کہ "ان کی نظمیں ان کی غزل کی توسیع ہیں" انہوں نے ایک خوبصورت مگر حقیقت پر مبنی ادبی نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ "مجاز کا ذہن زبان کے استعمال کے معاملہ میں نیم کلاسیکی اور فکر کے معاملہ میں تازہ کار ہے" ان میں نیا پن کے ساتھ زیادہ اپنا پن، زیادہ جانی پہچانی فضا اور اپنی آرزوؤں اور تمناؤں سے زیادہ قربت کا احساس ہوتا ہے۔ (صفحہ: 113)

؎ بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں ڈرتے نہیں سیاست اہل جہاں سے ہم

؎ سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

ان کی غزلوں میں خودکلامی کا انداز پایا جاتا ہے جو بڑی باتوں سے مرعوب کرنے کے بجائے کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی ایک ترنگ نے کوئی معانیاتی نظام تو نہیں بنایا لیکن اہتزازی کیفیت کے ساتھ بلند پروازی پر مائل کرتے ہیں۔ مجاز کے غزلیہ اشعار میں جابجا کلاسیکی اور معاصر اکابر شعرا کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں:

؎ کبھی یہ زعم کہ تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا کبھی یہ وہم کہ خود بھی چھپا ہوا ہوں میں

ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں بس کہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ

ان اشعار پر اقبال کے ان اشعار کی جھلک واضح ہے:

گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود گاہ الجھ کے رہ گئی میری توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

علم و ادب کی دنیا میں اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ تھوڑی سی اس مماثلت کے باوجود مجاز کی اپنی انفرادیت بہر حال مسلم ہے۔

مجاز کی ادبی اہمیت کے ذیل میں مصنف نے اپنے حاصل مطالعہ کی تلخیص پیش کردی ہے۔ مجاز کے دور کے سماجی و سیاسی حالات نے بعض وقتی مسائل و موضوعات کو

اسطرح ابھار دیا تھا کہ اس دور کے بڑے سے بڑے شاعر بھی ان سے متاثر ہوئے۔ مجاز بھی اچھوتے نہیں رہے اس حقیقت کے باوجود ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہنوز تازہ کار اور ہمارے جمالیاتی احساس کی تسکین کا باعث ہے۔ ان کی بعض سیاسی نظموں کی اب اتنی اہمیت نہیں رہی لیکن فکری ارتقا میں ان کی تاریخی اہمیت اب بھی برقرار ہے۔ مجاز کی حقیقت پسندی، بے تکلف اور بے ساختہ اظہار اور سادہ بیانی آج بھی ہمارے دلوں کو چھو لیتی ہے۔ ان کی کلاسکیت دراصل ایک خاص طرح کی شائستگی اور تہذیب کی پیداوار ہے۔ محبت میں ناکامی کے باوجود وہ محبوب کی بے وفائی کا شکوہ نہیں کرتے۔ محبت میں ناکامی کا الزام محبوبہ کے بجائے ''زمانے کے قوانین کہن اور آئین فرسودہ'' پر رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں یہ ان کی منفرد سوچ ہے۔

؎ زمانے کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے +قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

کلام مجاز میں ''جو تہذیب شعر اور تہذیب زبان ہے'' وہ اس عہد میں کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی اس حقیقت کو ناقد نے مجنوں گورکھپوری کے ایک اقتباس سے مستحکم کیا ہے:

> ''مجاز کی شاعری بڑی تربیت یافتہ اور مہذب ہے۔ اس کی شاعری میں وزن، وقار اور شائستگی جس ہمواری کے ساتھ ملتی ہے وہ ہمیں اس دور کے کسی دوسرے اردو شاعر میں نہیں ملتی''

مصنف نے مجاز کی مقبولیت کے راز کو آخر میں چند جامع فقروں میں ملخص کر کے پیش کر دیا ہے۔ مجاز کے ''احترام فن، رچا ہوا جمالیاتی احساس، زبان کی سادگی، الفاظ کا خلاقانہ استعمال، غنایت کے ساتھ شدید حسیت، زمینی حقیقت سے گہرا رشتہ، ترقی پسند فکر اور جذبے کا بے تصنع اظہار، ان کی شاعری میں آج بھی اثر آفرینی، زندگی اور تازگی کا احساس دلاتا ہے'' (صفحہ:123)

اس کے بعد صفحہ 125 تا 144 میں مجاز کی نظموں اور غزلوں کا اس طرح انتخاب

پیش کیا گیا ہے کہ قاری راست مطالعہ سے مذکورہ بالا نتائج اخذ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کرے۔ یوں تو اندنوں کسی فنکار کی "حیات اور شاعری اور حیات اور فن" پر ہر روز رطب و یابس کا ایک سلسلہ جاری ہے مگر اس مختصری کی تصنیف میں بیک وقت مجاز کی زندگی اور فکر و فن کو جس خوبی اور مدلل انداز میں پروفیسر شارب ردولوی نے پیش کیا ہے اس کی مثال شاذ ہے۔ مصنف کے تجزیاتی انداز، تہذیب نفس، سلامت روی اور تنقیدی زبان و بیان پر قدرت سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ جابجا ان کے خیال انگیز فقروں اور جملوں میں شعر کی سی لطافت اور معنی خیزی نے عجب دلکشی پیدا کردی ہے چند جملے ملاحظہ ہوں اور آپ بھی محظوظ ہوں:۔

☆۔"جب فکر و خیال اور حقیقت کا تضاد سامنے آتا ہے تو اسی سے یاسیت پیدا ہوتی ہے (صفحہ:79)

☆۔ادب اور شاعری، انقلابی ہو یا سیاسی اس کی بنیادی شرط جمالیاتی انبساط، کیف اور اثر آفرینی ہے (صفحہ:84)

☆۔جنگ میں پھول نہیں برستے آگ کی بارش اور موت کا رقص ہوتا ہے (صفحہ:85)

☆۔مجاز کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت تین باتوں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔اول جذبات نگاری دوسرے پیکر تراشی و تصویر کشی اور تہذیب عاشقی" (صفحہ:103)

☆۔ان کی شاعری کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں ان کی غزل کی توسیع ہیں (صفحہ:113)

ڈاکٹر ظفر حبیب کی تنقید نگاری

ڈاکٹر ظفر حبیب ان خوش نصیبوں میں ہیں جنھیں قسام ازل نے بیک وقت نظم و نثر دونوں میں خامہ فرسائی کی وافر صلاحیت بخشی ہے۔ یوں تو موصوف گزشتہ چار دہائیوں سے بھی زاید عرصہ سے علمی و ادبی اور تنقیدی و تخلیقی مسائل پر مسلسل لکھ رہے ہیں مگر ان کے ۱۴ تنقیدی مضامین کا اولین مجموعہ "تفہیمات و تنقیدات" پہلی بار دو سال قبل (۲۰۰۸) منظر عام پر آیا۔ ان یکجا مقالات کے سرسری مطالعہ سے بھی ظفر حبیب کے ادبی و تنقیدی نقطۂ نظر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ان کا خیال ہے کہ:

> "تخلیق فن اور تنقید فن، ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ہیئت و مواد کا رشتہ، ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ۔ یہ موضوعات ادب کے مستقل موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

تخلیق و تنقید کے باہمی رشتے کو ناقد نے مدلل و متوازن انداز میں مشرق و مغرب کے بعض معروف ناقدین بالخصوص پروفیسر اختر اورنیوی کے حوالے سے پیش کیا ہے، وہ اندونوں کو لازم و ملزوم اور زندگی سے مربوط قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں تخلیق میں تنقید اور تنقید میں تخلیقی عناصر از اول تا آخر غیر محسوس طور پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے فرق کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے:

> بات تو یہ ہے کہ تخلیق فن کے وقت تخلیق غالب و رہنما ہوتی ہے اور قوت تنقید ماتحت ہو کر کام کرتی ہے۔ اس کے برخلاف تنقید فن کے وقت تنقیدی قوت فائق اور حاوی ہوتی ہے اور تخلیقی قوت اس کے ماتحت بر سرکار ہوتی ہے۔"

تخلیق وتنقید کے اسی وسیع تر تناظر میں ظفر حبیب نے اس مجموعہ کے مضامین میں ،اقبال، پریم چند، میر، درد، نیاز اور یدی وغیرہ کے فکر وفن کے مختلف پہلوؤں پر گہری تجزیاتی نظر ڈالی ہے۔

''اقبال کا نظریۂ تعلیم'' کے زیر عنوان ناقد نے اپنے مبسوط مقالے میں اقبال کے اردو و فارسی کلام اور ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے علاوہ معتبر ناقدین و محققین کی آرا کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اقبال ''علم دین اور علم دنیا'' کی دوئی کے برخلاف اسلامی نظریۂ تعلیم ''علم نافع'' کے قائل تھے بالفاظ شاعر مشرق:

ولایت پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

اس مجموعے میں اقبال پر دو مقالے اور ہیں ''خالق و مخلوق کے رشتے کی مختلف جہتیں (کلام اقبال کی روشنی میں)'' اور ''اقبال اور صنف نازک'' ان دونوں موضوعات پر بھی اقبال کے دینی فکر نے انہیں حد اعتدال میں رکھا اور مغرب کے ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' اور مشرق کے مذہبی استحصالی رویے دونوں کی سطحیت اور ہلاکت خیزی کو واشگاف کیا ہے۔ اور عقل و عشق کے حوالے سے یہ انقلابی فکر پیش کیا ہے کہ:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

مزید یہ کہ عورت کو ''سرمایۂ ملت کا نگہدار'' ماننے کے باوجود انہیں تہذیب فرنگی کے فتنے سے ہوشیار کرتے ہوئے حضرت فاطمہ زہراؑ کی سیرت مقدسہ کو اپنا آئیڈیل بنانے کی تلقین کی ہے:

فطرت تو جذبہ ہا داری بلند — چشم ہوش از اسوۂ زہراؑ مبند
تا حسینے شاخ تو بار آورد — موسم پیشین بہ گلزار آورد

دیگر شعرا پر تنقیدی مضامین میں میرؔ (مت سہل ہمیں جانو) درد (بحیثیت غزل گو) بہادر شاہ ظفر (اردو شاعری کا ایک المیہ کردار) اور نظیر اکبر آبادی (قومی یکجہتی کا نقیب) کے عنوانات کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ میرؔ کے سلسلے میں مصنف آبِ حیات کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو خاصی شہرت ملی کہ ''میر آہ کے اور سودا واہ کے شاعر تھے'' اسمیں شک نہیں کہ میر کی ذاتی زندگی اور اجتماعی طور پر ملک کی سیاسی و سماجی زندگی کے بحران نے ''اب خرابہ ہوا جہان آباد'' اور ''دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں''، کی صورتحال پیدا کردی تھی یہاں تک کہ میرؔ کو ہجرت بھی کرنی پڑی ان تمام المیہ حقائق کے باوجود ان کی شاعری میں خاص و عام کے لیے بیشک ایک اپیل موجود ہے۔ مختلف حوالوں اور مطالعوں کی روشنی میں ڈاکٹر ظفر حبیب کا یہ خیال مبنی پر حقیقت ہے کہ:

> ''ان کے یہاں زندگی کی چہل پہل دھما چوکڑی، ہنگامہ، محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور ناز و نیاز، طنز و چٹکی بھی ہے اور عارفانہ و صوفیانہ مضمون یا حسن محبوب کا فرحت بخش تذکرہ بھی، اس کے پہلو بہ پہلو، شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے۔ نیز سنجیدگی، زبان میں سادگی و صفائی، تشبیہ و استعارے اور تمثیل و محاورات کی بھی بہار ہے۔''

اس لیے ذوق کا یہ اعتراف مبنی بر حقیقت ہی کہا جائے گا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ظفر حبیب اپنی تنقید کو تحقیقی کاوشوں سے مدلل و موثر بنانے کا ہنر جانتے ہیں چانچہ بیشتر مضامین میں اپنے پیش رو معروف و مستند محققین و ناقدین کی آرا کا تفصیلی مطالعہ کر کے حسب ضرورت ان کے بعض اقتباسات کو بھی جا بجا پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''قومی یکجہتی کا نقیب (نظیر اکبر آبادی) ان کا ایک مثالی مقالہ کہے جانے کا مستحق ہے، جس میں انہوں نے پروفیسر عبدالغفور شہباز عظیم آبادی، ڈاکٹر اختر اورینوی، پروفیسر کلیم الدین احمد،

نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، ٹی ایس ایلیٹ، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، احتشام حسین، سیماب اکبرآبادی، عبدالباری آسی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، وغیرہ کی کاوشوں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ہی اس مبسوط مقالے کو قلمبند کیا ہے۔ موصوف نے جابجا تقابلی مطالعوں اور مثالوں سے اپنے دلائل کو مستحکم کیا ہے۔ کہیں کہیں بزرگ ناقدین سے اپنے اختلاف کو پیش کرنے میں بھی کسی تکلف یا جھجک سے کام نہیں لیا ہے۔ نظیر پر تفصیلی نقد و تحقیق کا ماحصل ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> ''میرا یہ اصرار ہے کہ قومی یکجہتی کے تصور کو عام کرنے کے لیے اردو میں نظیر اکبرآبادی کو اور ہندی میں کبیر داس کو عوامی طور پر روشناس کرانے کی سخت ضرورت ہے''۔

کیونکہ ظفر حبیب نے، اختر اورینوی کے اقبال و نظیر اکبرآبادی کے تقابلی مطالعہ کے متعدد نکات کی تائید و توثیق کرتے ہوئے مزید ایک پہلو کا معنٰی خیز اضافہ بھی کیا ہے ناقد ہی کے لفظوں میں:

''اقبال حکیم الامت اور غم خوار ملت تھے تو نظیر محب العالم اور غم گسار ابن آدم تھے''

شعرا کے علاوہ اردو نثر کے معروف تخلیق کار اور ناقدین میں پریم چند پر اقبال کی طرح تین مقالوں کے علاوہ، شبلی نعمانی، نیاز فتحپوری اور راجندر سنگھ بیدی کے بھی فکر و فن پر خیال انگیز روشنی ڈالی گئی ہے۔ پریم چند کے ان تینوں مضامین میں ان کی زبان و بیان، فکر و نظر اور ان کے افسانوی مقام و مرتبے کی بخوبی وضاحت ہوگئی ہے۔ ان کی نثر کو ڈاکٹر محمد حسن کے حوالے سے تحریک آزادی کا مولانا آزاد کی نثر کی طرح ایک قیمتی تحفہ قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں قلم کے اس سپاہی نے عمر بھر غلام ملک کے جس طبقہ اور زمرۂ عوام کے مسائل و مصائب کو اپنے فکر و فن کا موضوع بنایا ہے اور ان کے لیے جس طرز اظہار کو اختیار کیا ہے وہی حقیقی ہندوستانی یا اردو زبان ہے۔ مستقبل کے ہندوستان کو بھی جو زبان جوڑ کے رکھ سکتی ہے

وہ پریم چند ہی کی زبان ہو سکتی ہے پریم چند کے فن کا مقبول و مشہور کمال انسانیت کے دکھ درد سے سچی ہمدردی اور اس ضمن میں اخلاقی اقدار کی نشو و نما رہی ہے جسے وہ قصے کے پیرائے میں پورے وزن و وقار کے ساتھ پیش کرتے تھے، ناقد نے مختلف حوالوں سے بعض ناقدین کی اپنی اپنی تعبیر و توضیح کی روشنی میں پریم چند کی کبھی اصلاح پسندی کو نمایاں کیا ہے تو کبھی ان کے "گاندھیائی" یا "اشتراکی" عینیت یا مثالیت کو ابھار کے اپنی من پسند مہر ثبت کی ہے۔ ڈاکٹر ظفر حبیب نے پریم چند کی طبقہ نسواں سے ہمدردی اور انسان دوستی، کو بجا طور پر نمایاں کیا ہے۔ مگر "تنازع کے مابین ایستادہ پریم چند" اور دوسرے مقالے میں بھی پریم چند کی فکر سے بحث کرتے ہوئے ان کے آریہ سماجی نقطۂ نظر اور ہندو نشاۃ الثانیہ کے زیر اثر ان کے مخصوص نظریہ حیات اور تصور مذہب کو "ستی اور رانی سارندھا" کے حوالے سے واضح کرنے کے باوجود کسی متعصبانہ احساس کو اجاگر نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا اقبال اور کبیر داس کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ ہر فنکار کسی نہ کسی نظریہ یا نصب العین کا حامل ضرور ہوتا ہے، جو خواہی نخواہی لاشعوری طور پر اس، کے فن یا تخلیق میں جھلک جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسکی یہ انسانیت نواز قدریں مقبول عام ہوں منشا وعظ و تبلیغ نہیں ہوتا، پریم چند نے کہانی کے فن کو "دھرپد کی تان" سے تعبیر کیا ہے جس سے اردو افسانے کا ذہن آج تک پاکیزہ رنگینیوں سے بیشک لبریز ہے اسی لیے وقار عظیم نے سچ کہا تھا کہ "اس نے (پریم چند) اردو کے افسانوی ادب کو اتنا کچھ عطا کیا جس سے آج تک جھولیاں بھری جا رہی ہیں"

ظفر حبیب کی تنقید نگاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ استفادہ اور مطالعہ و تحقیق کے معاملے میں اپنے ذہن و فکر کی کھڑکیوں کو کھلا رکھتے ہیں۔ مگر کسی قطعی رائے کے اظہار میں اپنے تعمیری و اخلاقی نقطۂ نظر اور متوازن و معتدل رویے سے کبھی دامن کش نہیں ہوتے بلکہ رد و قبول کی جھجک سے بے نیاز ہو کر اپنی فکر کو مدلل و مبرہن بنا کے پیش کرتے ہیں اور اس پر قائم رہتے ہیں۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی کو موصوف قومی یکجہتی کا نقیب ماننے کے معاملے میں کبیر

داس کا ہم پلہ و ہم رکاب تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں اردو کے ساتھ ایک صدی سے زاید عرصہ برادران وطن کا تعصب و تنگ نظری اور اکثریتی تفاخر نیز خود اردو والوں کی "اشرافیت نوازی" اور احساس کہتری کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح موصوف نے بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ عظمت سے مولانا حالی اور حسین آزاد کی روگردانی پر گرفت کرتے ہوئے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ "میر کے بعد اس کا اگر صحیح جانشین کوئی پیدا ہوا تو وہ ظفر تھا اور اس کی نمایاں جھلک اس کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہے" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "میر کے بعد سہل پسندی اور سادگی شیوہ شاعر اگر کوئی ہے تو وہ ظفر ہے" (اردو شاعری کا ایک المیہ کردار) اور فی الواقع پوری تفصیل سے اس حقیقت کو انہوں نے ثابت بھی کیا ہے۔ تاریخی صداقت تو یہی ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے جن المناک حالات و حادثات قید و جلاوطنی مہاجرت اپنے خاندان اور ملک و ملت کی تباہی و بربادی اور آگ کے دریا سے گزرنے کے خونیں واقعات کو بچشم خود دیکھا ہی نہیں بلکہ جھیلا بھی اس کا عشر عشیر بھی میر کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی اس لیے اگر وہ اپنے کو "بیکسی کا مزار" اور "مشت غبار" کہتے ہیں جس کا نہ کوئی "مونس نہ کوئی غمگسار" تھا تو اسمیں ذرہ برابر مبالغہ نہیں۔ بلکہ تاریخ کی شہادت تو یہ ہے کہ وہ "بدنصیب" آخری تاجدار مغلیہ قلعہ معلی میں منافقوں غداروں اور سودخوروں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے "ظفر کی شاعری میں اتنا درد ہے اتنا گداز ہے کہ سننے سے کلیجہ شق ہو جاتا ہے" مگر ان کے کلام میں درد و الم کے علاوہ جملہ اصناف سخن میں، فہم و فراست، گہرائی و گیرائی، سادگی و سلاست نگاری اور عارفانہ و صوفیانہ رنگ و نور کے لعل و گہر بھی جڑے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ شروع ہی میں عرض کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر ظفر حبیب چونکہ خود بھی شاعر اور افسانہ نگار ہیں اس لیے شعر و سخن کے جمالیاتی تقاضے ہوں یا افسانہ کی فنی باریکیاں انہیں ان اصناف کی نزاکتوں اور لطافتوں کا نظری ہی نہیں عملی شعور بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راجندر

سنگھ بیدی ہوں یا فکری وفنی اعتبار سے ان کے متضاد فنکار نیاز فتحپوری مولانا حالی ہوں یا علامہ شبلی ان پر نقد ونظر میں اختصار کے باوجود ان کی مدلل آرا کا قاری کو قائل ہونا پڑتا ہے۔ بیدی کا مطالعہ انہوں نے "اپنے دکھ مجھے دیدو" کے خصوصی حوالے سے کیا ہے مگر اس بہانے بیدی کے فکر وفن اور ان کے تدریجی وارتقائی مراحل کی بھی خوب نشاندہی کی ہے۔ معاملہ فکر وفن کا ہو یا روایت وجدت پسندی کا، علامتی انداز بیان کا ہو یا کہانی پن کا، بیدی نے ہر جگہ اعتدال وتوازن کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ناقد نے بیدی کی زبان کے کھردرا پن اور ٹھوس پن کے ساتھ استعارہ اور اساطیری تصورات کے استعمال سے اپنے فن کی شناخت کا اردو دنیا سے جس طرح لوہا منوایا ہے، اس کی وضاحت میں ظفر حبیب نے اختصار کے باوجود کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ اس کے برعکس نیاز فتحپوری کی خالص رومانی وجمالیاتی افسانہ نگاری کے باوجود نیاز نے سماجی مسائل تاریخی واقعات اور نفسیاتی بوقلمونیوں کے بھی جو گل بوٹے کھلائے ہیں ان سے ناقد نے صرف نظر نہیں کیا ہے۔ ناقد نے نیاز کی دو کمزوریوں کو بھی واشگاف کر دیا ہے۔ یعنی:

"ان کی ہر تحریر عورت کے حسن کی مداحی اور مولوی سے نفرت کے گرد گھومتی ہے"۔ (علامہ نیاز فتح پوری، بحیثیت افسانہ نگار)

نیاز کی رومانی ماورائیت ومثالیت ظاہر وباہر ہے مگر افسانے کی فنی نزاکتوں سے وہ بخوبی واقف تھے اور اپنے انداز سے ان کو برت کے اپنی انفرادیت کو اردو دنیا سے تسلیم بھی کروایا۔ وہ افسانے میں واقعیت، پلاٹ کی جزوی تقسیم، ہلکا سا مزاح، تھوڑا سا تمثیلی رنگ اور ان سب کے ساتھ ٹریجڈی کے وجود قدم قدم پر چونکا دینے والے تذبذب وتجسس کے استعمال سے اپنے افسانوں کو مزین کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان صلاحیتوں کے باوصف ناقد کی آخری رائے سے قاری کو اتفاق کے ساتھ اختلاف کا بھی حق بہر حال ہے۔

"..... پھر بھی نیاز اردو کے قابل قدر افسانہ نگار نہیں"

اس مجموعہ مقالات کا آخری مضمون ''علامہ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری'' ہے۔شبلی کی تنقیدی اہمیت کو وہ آغاز ہی میں ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

''خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد شبلی نعمانی فلک تنقیدی کا دوسرا درخشندہ ستارہ ہیں''۔

اسی لیے کلیم الدین احمد کی اس منفی رائے ''شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ معلق نظر آتے ہیں'' کو ان کی ''ذاتی رائے'' اور ''مخصوص انداز تحریر'' قرار دیکر رد کرتے ہوئے انہوں نے شبلی کی تنقید کو ''روایت اور درایت کا حسین سنگم'' ثابت کیا ہے۔اس ضمن میں ''شعرالعجم حصہ اول وچہارم، سوانح مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ، موازنہ انیس ودبیر اور مقالات شبلی'' کا بجا طور پر تذکرہ کیا ہے کہ یہی سب مواد شبلی کا پیش قیمت تنقیدی سرمایہ ہے۔موصوف اس خیال کی بھی تردید کرتے ہیں کہ ''شبلی حالی کے خوشہ چین تھے'' ظفر حبیب نے بڑی خوبی سے دونوں بزرگ ناقدین کی بعض مسائل میں مماثلت کے باوجود ان کے فرق وامتیاز کو واضح کیا ہے۔ مقدمہ حالی کے بعض اہم نکات مثلاً ''مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ'' کے بالمقابل شبلی نے شاعری کے معنوی پہلوؤں کے ساتھ اس کے صوری حسن پر حالی سے زیادہ خوبی کے ساتھ اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔شبلی کی تنقید کو انہوں نے ''جمالیاتی نقطۂ نظر'' کا نام دیا ہے اور موازنہ انیس ودبیر کے حوالے سے اس کو ''موازناتی، تقابلی، تاثراتی اور عملی تنقید'' کا نمونہ قرار دیا ہے۔اور اسے ''اردو کے تنقیدی سرمایہ میں بجا طور پر بیش بہا اضافہ'' سے منسوب کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر حبیب اپنے متوازن تنقیدی فکر ونظر کو جو پیرائیہ اظہار بخشتے ہیں وہ فن تنقید کے حسب حال ہے۔وہ خوب جانتے ہیں کہ تنقید، ادب وتخلیق کی جانچ اور پرکھ کا دوسرا نام ہے اس لیے وہ جس صنف، فن یا فنکار پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں حتی الوسعی اسکی تمام تفصیلات کے مطالعہ وتحقیق کے بعد اخذ نتائج پیش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ بعض

اکابرین کے انتہا پسندانہ خیالات یا علمی مغالطوں پر بیباکی سے گرفت کرنے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیتے ۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان مضامین کو ناقدین واہل علم بھی دیکھیں، جانچیں اور پرکھیں اور اردو کے باذوق قاری نیز منتہی طلبا بھی چاہیں تو استفادہ کریں ۔ غالباً اس ہمہ گیر افادی نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ اپنے مضامین میں طول طویل مسلسل اقتباسات پیش کرتے ہیں، جو بسا اوقات افادیت کے باوجود بوجھل اور مبتدیانہ تاثر پیدا کرتے ہیں ۔اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی ''تنقیدات'' پر ''تفہیمات'' غالب آگئی ہے ۔گوکہ تنقیدی عمل میں تفہیم کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔بہر حال ڈاکٹر ظفر حبیب کی تنقیدی نگارشات اردو میں قیمتی اضافہ ہیں اور اسکا سلسلہ جاری رہنا چاہئے ۔

جھارکھنڈ کے چند اہم فنکار[1]

ہندوستان کے جغرافیائی نقشے پر صوبۂ جھارکھنڈ نہ صرف فلک بوس پہاڑوں، گھنے جنگلوں، حسین مناظر، پرکشش آبشار اور قیمتی معدنیات وغیرہ کے لئے اپنی ایک شناخت رکھتا ہے بلکہ یہاں کی تہذیب وثقافت، شعروادب، لوک گیت، لوک رقص، کے علاوہ دیگر تمام فنون لطیفہ کی نشو ونما اور ارتقاء میں جھارکھنڈ کے فنکاروں کی ناقابل فراموش خدمات رہی ہیں۔ اردو شعروادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یوں تو جھارکھنڈ میں اردو زبان کی بنیاد عہد جہانگیری میں صوفیا وتاجروں کی آمد سے سولہویں صدی میں ہی پڑ چکی تھی لیکن بیسویں صدی میں خصوصاً پانچویں دہائی کے بعد کا عہد یہاں کے لئے اردو کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ مجھے یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں، نقادوں اور ادبی مورخوں نے جھارکھنڈ کے اردو فنکاروں کے تئیں نہ صرف بے اعتنائیاں برتیں بلکہ سہل انگاری کے سبب یہاں کے ادبی جواہر پاروں کے مطالعہ وتحقیق سے محروم رہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں اردو کی جتنی تحریکات ورجحانات وجود میں آئے ان میں جھارکھنڈ کے ادباء وشعرا نے نہ صرف بڑھ چڑھ کے حصہ لیا بلکہ ان کے حوالے سے اپنی شناخت بنائی۔ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں جھارکھنڈ کے جن فنکاروں پر نگاہیں ٹھہرتی ہیں ان میں مظہر شہاب، بی۔ زیڈ۔ مائل، کیف پرتاپ گڑھی، احمد عظیم آبادی، ایسے نام ہیں جو ترقی پسند تحریک کی تاریخ کے اہم اوراق کہے جاسکتے ہیں۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور بہار کے پریم چند سہیل عظیم آبادی نے ترقی پسند تحریک اور اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لئے جھارکھنڈ کے خطے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] جھارکھنڈ کے ایک ادبی سمینار کے موقع پر مختصر تعارفی کلمات۔

1960ء کے بعد جدیدیت نے جب اردو ادب میں اپنا قدم جمانا شروع کیا تو جھارکھنڈ کے فنکاروں میں پرکاش فکری، وہاب دانش، صدیق مجیبی وغیرہ نے اپنی تخلیقات کے توسط سے جدید شاعری کے سرمائے میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اپنے فن اور اسلوب میں بھی آخر وقت تک اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ غیاث احمد گدی اور الیاس احمد گدی نہ صرف جھارکھنڈ کے بلند پایہ فکشن نگار ہیں بلکہ اردو فکشن کی تاریخ جھارکھنڈ کے ان دو فنکاروں کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ بہتر یہ ہوگا کہ مشت نمونہ از خروارے محض چند نمایاں فنکاروں کی ادبی و شعری خدمات کا سرسری تذکرہ کر دیا جائے:۔

پرکاش فکری:۔ 1960ء کے بعد اردو کے جن فنکاروں نے ترقی پسند تحریک سے اخذ و اکتساب کے بعد جدید شعری میلانات و رجحانات کے فروغ اور اس کی ترقی و توسیع میں اپنے تخلیقی ذہن کی غیر معمولی کارگذاریوں کا احساس دلایا ہے ان میں ایک اہم اور نمایاں نام پرکاش فکری کا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے داخلی تجربات کے اظہار کے لئے غزل کا انتخاب کیا اور آخر دم تک پورے خلوص توانائی اور شیفتگی کے ساتھ غزل سے تعلق خاطر قائم رکھا۔ ان کے شعری مجموعے ''سفر ستارہ'' اور ''ایک ذرا سی بارش'' شائع ہو کر نقادان فن سے خراج تحسین تو حاصل کر چکے ہیں لیکن المیہ یہ بھی ہے کہ اتنے بلند پایہ شاعر کی تخلیقات کی قدر و قیمت کا تعین نہ ہو سکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پرکاش فکری کی شاعری کی مختلف جہات کا تجزیہ کیا جائے مثلاً پرکاش فکری کی شاعری میں علامات و استعارات کی پیشکش، پرکاش فکری کی شاعری میں عصری کرب، پرکاش فکری کی شاعری میں مقامی لفظیات کا حسین برتاؤ اس کے مظاہر، رسوم اور اساطیر سے وابستگی کا اظہار وغیرہ۔

وہاب دانش: جھارکھنڈ کے فنکاروں میں وہاب دانش کا شمار جدیدیت کے اہم اور مضبوط ستونوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری خصوصاً نظموں کے مطالعے سے اس نکتے کا

انکشاف ہوتا ہے کہ شاعر کے باطن کی دنیا خارج کے مظاہر سے منسلک اور ہم آہنگ ہے لیکن یہ مشاہدہ محض خارجی ماحول کی تصویر کشی تک محدود نہیں بلکہ یہ سارا ماحول اور اس کی اشیاء شاعر کے تجربے کی چکا چوند سے اکتساب نور بھی کرتی ہیں اور نتیجتاً ہانپتی کانپتی، دھڑکتی اور مچلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہاب دانش کا شعری مجموعہ "لب مماس" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار اپنی ذات کی قندیل سے کائنات کو روشن کرنے کا متمنی ہے۔ "لب مماس" کی نظموں میں جذباتی موضوعات کی بندشوں کے باوجود تفکر کی ایک باریک سی لکیر ابھری ہوئی نظر آتی ہے۔ افسوس کہ جھارکھنڈ کے اس فنکار کے ادبی سرمایے کی طرف نقادوں نے توجہ نہیں کی۔ وہاب دانش کی فنکارانہ حیثیت کو اجاگر نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ ادب کا بیش بہا سرمایہ گوشۂ گمنامی کی دبیز چادر میں گم نہ ہو جائے۔

صدیقی مجیبی: جدید شاعری کا ایک معتبر نام اور شعری مجموعہ "شجر ممنوعہ" کے تخلیق کار صدیق مجیبی کی غزلیہ شاعری شدت احساس کا ایک البم ہے۔ صدیق مجیبی کا باطن آتشیں سیل جب اس کے سانس میں ڈھل کر نکلتا ہے تو شرارہ بن جاتا ہے۔ صدیق مجیبی نے تہذیب کے شکست و ریخت کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی غزلوں کے توسط سے وہ ایک بھرپور توانائی اور شدت کے ساتھ سچائی کو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ صدیق مجیبی کے یہاں، کربلا، کا استعارہ اور اس کے متعلقات فنکار کے اسی شدت احساس کے غماز ہیں۔ نصف صدی سے اردو شاعری کی آبیاری کرنے والے اس فنکار کی ادبی شناخت تو بنی لیکن ان کی تخلیقات کے رموز و نکات کو اجاگر نہیں کیا جا سکا۔ "شجر ممنوعہ" کا خالق کتنی نفسیاتی کیفیتوں سے گذر رہا ہے ان پر بحث کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی لفظیات و علامات کی کتنی جہتیں صدیق مجیبی کے یہاں ہیں ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

غیاث احمد گدی: اردو فکشن جو 1960ء کے بعد ایک نئی کروٹ لیتی ہے اور جدیدیت کے زیر اثر استعاروں، علامتوں کی اظہاریت کی تحریک زور پکڑتی ہے تو جھارکھنڈ

کے فکشن نگار غیاث احمد گدی ایک ایسے رجائی افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے جو زندگی کے مثبت پہلوؤں پر زور دیتے رہے۔ان کے یہاں فن دراصل ہمدردی کی فضا کو پھیلانے اور صداقتوں کو محفوظ کرنے کا نام ہے۔ان کی کہانیوں کے مجموعے ''بابا لوگ'' ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، ''سارا دن دھوپ میں'' کے حوالے سے غیاث کے فن کو پورے کیف وکم کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔غیاث احمد گدی کے فن کی شناخت کا ایک پہلو ان کا استعاراتی اسلوب بھی ہے۔مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ اردو افسانہ نگاری میں راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ یہ اسلوب کسی کے یہاں ہے تو غیاث احمد گدی کے یہاں ہے۔اتنے بلند پایہ فکشن نگار کے افسانوی سرمایے کی فکری وفنی قدر و قیمت کا تعین عصری تنقیدی معیار پر ہو۔ تا کہ ان کے معیار ووقار کو ادبی دنیا تسلیم کرے۔

الیاس احمد گدی: ناول ''فائر ایریا'' جس کی تخلیق پر فنکار کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ہمارے بعض معتبر ناقدین نے اس علاقائی ناول پر کھل کر بحث بھی کی ہے لیکن ابھی بھی کئی جہتیں ایسی ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا حقائق ہمارے اس دعویٰ کو تقویت بخشتے ہیں کہ جھارکھنڈ کے ادبی سرمایے خصوصاً 1960ء کے بعد شعر ونثر پر مفصل اظہار خیال نہیں کیا جا سکا ہے۔اسی لئے ہم نے مجوزہ سمینار کا موضوع جھارکھنڈ میں اردو نثر اور شاعری کے رجحانات رکھا ہے۔(منعقدہ 20دسمبر 2009ء) اور جھارکھنڈ نیز بیرون جھارکھنڈ کے ہر مکتب فکر کے درجنوں اہم ناقدین ومحققین ادب سے شرکت کی درخواست کی۔چنانچہ متعدد ارباب دانش وادب نے اپنے قیمتی مقالات کے ساتھ شرکت کی۔اس اہتمام اور کاوش کے باوجود جھارکھنڈ کے متعدد اہم شعراء وادباء کے فکر وفن پر وعدے کے باوجود بروقت مقالات دستیاب نہ ہو سکے اس لئے ہم ان کی اشاعت سے محروم ہیں۔مگر کوئی علمی وادبی کاوش حرف آخر نہیں ہوتی ہم نے ایک پیش رفت کی ہے،خود ہمیں موقع ملا تو دوسرے سمینار میں اس کمی کی تلافی کی جائے گی۔ویسے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

جھارکھنڈ میں اردو نثر اور شاعری کی سمت و رفتار ۱۹۶۰ء کے بعد[1]

حضرات گرامی! صدیوں کے ادبی ارتقا کے باوجود دبستان لکھنؤ اور دہلی کا جب واضح فرق کرنا ممکن نہ ہو سکا تو ابھی کل تک کے چھوٹا ناگپور یا جھارکھنڈ اور بہار یا ملک کے بقیہ حصوں سے یہاں کی بالکل علیحدہ ادبی اہمیت و حیثیت کو جتانا بھی کہاں کی دانشمندی ہوگی، البتہ اس حقیقت کے اعتراف میں مبالغہ نہیں کہ علاقہ جھارکھنڈ میں اردو شعر و نثر اور تحقیق و تنقید کی شاندار روایت اور انمٹ کارنامے ناقابل فراموش ہیں، اس کے باوجود اردو تنقید و تحقیق نے ان کی اہمیت و معنویت کے اعتراف میں خاصی تاخیر اور قدرے بخل سے کام لیا ہے۔ اس سمینار کے ذریعہ ہم جھارکھنڈ کے ماضی و حال کے تخلیق کاروں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور تلافی مافات کی جانب اردو دنیا کو متوجہ کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کر رہے ہیں، کیونکہ ہم مردہ پرستی کے قائل نہیں ہیں بلکہ زندوں کی ادبی کاوشوں کے قدرداں اور معترف ہیں۔ البتہ اس سمینار میں وقت کی تنگی کے سبب بیشتر ماضی قریب کے محسنین اردو کی خدمات کا ذکر کریں گے، ہاں آپ کے یہ مقالات جب کتابی صورت میں شائع ہوں گے تو آج کے نمایاں فنکاروں کی خدمات کو انشاء اللہ ہرگز نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ٹرسٹیز کا یہ عزم ہے کہ وقتاً فوقتاً اس طرح کی بزم آرائی کر کے ہم نشستند و گفتند و برخاستند پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ عمومی طور پر اردو زبان و ادب کے مسائل اور ان کے حل اور خصوصی طور پر علاقہ جھارکھنڈ کے فنکاروں کی خدمات کے اعتراف نامے بھی شائع کریں گے۔ تاکہ ہمارے تخلیقی سوتے خشک نہ ہوں، ان کا جائزہ، محاسبہ، قدر افزائی اور تہذیبی عمل

---

[1] خطبۂ افتتاحیہ قومی سمینار بعنوان: ''جھارکھنڈ میں اردو نثر اور شاعری کی سمت و رفتار ۱۹۶۰ء کے بعد۔ منعقدہ ۲۰/دسمبر ۲۰۰۹ء۔

جاری وساری رہے۔

محترم خواتین وحضرات! جھارکھنڈ کے پہاڑ اور جنگل، جھیل اور آبشاروں کا حسن، علاقے کا رنگارنگ کلچر، لوگوں کی سادگی و بے ریائی، وقت کے ساتھ معدنیات کی دریافت اور صنعت وحرفت کے پھیلاؤ، سرمایہ دارانہ استحصال اور فرقہ وارانہ فسادات، آبادی کا سیلاب، سیاسی لوٹ کھسوٹ، دیہاتوں کی ہمہ جہت پسماندگی مگر شہروں کی گہما گہمی، بے حسی اور بے عملی، بالخصوص ۱۹۶۰ء کے بعد، یہاں کی شعری ونثری تخلیقات میں بڑے موثر اور جمالیاتی انداز میں ابھر کے سامنے آئے ہیں۔ ماضی قریب میں یہاں کی مثالی فرقہ وارانہ ہم آہنگ فضا کو زہر آلود کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے مگر اردو کے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی بلکہ چینی جیالے فنکاروں نے قومی یکجہتی، انسانیت دوستی، امن پسندی اور اخلاق مندی کا تخلیقی علم اپنی جان دے کر بھی ہمیشہ بلند رکھا یہ سنہری زنجیر ۱۸۵۷ء کے شیخ بخاری یا شیخ بھکاری سے لے کر مولانا آزاد کی اسیری اور پروفیسر ذکی انور کی شہادت تک دراز ہے:

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

فاضل مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالوں میں ان کوششوں پر نہایت خیال انگیز روشنی ڈالی ہے۔

حاضرین کرام! یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے کئی برسوں تک اردو اور اردو آبادی پر بڑا کڑا وقت گذر چکا ہے، مگر ہم ہمت سے کام لیں تو حال کے علمی دھماکے اور مستقبل کے اشاریے نہایت حوصلہ افزا ہیں کیونکہ اردو محض ایک سائنٹفک زبان نہیں، یہ ایک عظیم کلچر کی ترجمان ہے، اب ہندی کے پریمی بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ اردو، ہندی کی حریف نہیں حلیف ہے، اس کی سوتن نہیں ماں جائی بہن اور اس کے ماتھے کی بندی ہے۔ لہٰذا دارالترجمہ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا ماتم کرنے کے بجائے یہ بھی دیکھئے کہ اسی شہر حیدرآباد میں اردو

کی جدید ترین یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے جو اردو کی علمی و سائنسی بنیادوں کو ملکی ہی نہیں بلکہ عالمی پیمانے پر مستحکم کر رہی ہے۔ آٹھ ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہیں۔ چھ ریاستوں میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہزاروں اردو کتابوں کی ناشر ہے، جس کے زیر اہتمام سالانہ تیس ہزار طالبات اور طلبا اردو کے ساتھ کمپیوٹر ڈپلوما کی اسناد حاصل کر رہے ہیں۔ پچاس ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے زیر تدریس ہے۔

؎ جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستانی سماج و سیاست کی مکارانہ پرتیں، نہایت پرفریب اور جان لیوا ہیں، یہاں ہر قدم پر ٹھوکریں، رکاوٹیں اور مسائل و مصائب کے پہاڑ کھڑے ہیں، تو کیا ان پتھروں کو توڑنے کی کچھ ہماری ذمہ داری نہیں بنتی۔ آخر کب تک دوسرے آپ کے جملہ حقوق طشت میں سجا کر پیش کرتے رہیں گے۔ ہم اردو والے بھی تو کچھ کریں، بقول استاذی علامہ جمیل مظہری:

؎ یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر

خواتین و حضرات! اب ایک نئے تناظر پر غور کیجئے کہ جملہ علوم و فنون کے انفجار علم (Knowledge Explosion) نے اندرون ملک کی طرح بیرون ملک میں بھی بعض جاں گسل چیلنجوں کے باوجود انفارمیشن ٹکنالوجی نے اردو رسم الخط کے لیے بھی عالمی یونی کوڈ کی آفاقی اسکرپٹ کی تمام سہولتیں مہیا کر دی ہیں، چنانچہ ایشیا، یورپ، امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا کے درجنوں ملکوں میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ ابھی پچھلے ہی

مہینہ یہ خاکسار ایک ماہ تک آسٹریلیا کے شہر سڈنی اور کینبرا کا دورہ سفیر اردو کی حیثیت سے کر کے آیا ہے۔ واضح ہو کہ تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ افراد اردو میں انٹرنٹ استعمال کر رہے ہیں۔ بی، بی، سی لندن کی اردو سائٹ ۳۰ ملین (۳ کروڑ) اور اردو نٹ کی سائٹ ۲۰ ملین (یعنی ۲ کروڑ) ہٹس حاصل کر رہی ہیں۔ مرکز ادب و سائنس ٹرسٹ نے اپنے مستقبل قریب کے پروگراموں میں ایک معیاری اردو الکٹرونک رسالہ کے اجرا اور ایک اچھی سائٹ کے خاکہ میں رنگ بھرنے کا عزم کیا ہے، جس سے توقع ہے کہ کارکرد لوگوں کا تعاون حاصل کر کے انشاءاللہ اس سائٹ پر کم از کم دو ملین ہٹ اور تین لاکھ قارئین و ناظرین مل سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں سامعین و ناظرین اور ہمدردوں کی ایک بڑی تعداد دستیاب ہوگی، جس سے ہم اپنے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی تخلیقات کے تحفظ و تشہیر کا سامان کر پائیں گے اور تازہ نگارشات و اقدامات کی برابر اشاعت ہوتی رہے گی۔ اس سے وسائل بھی فراہم ہوں گے اور ملکی و عالمی پیمانے پر ہم اردو کی ترویج و اشاعت اور معیار بندی کا فریضہ بھی انجام دیں گے، واضح ہو کہ محض چند افراد پر مشتمل ایک چھوٹی سی کارگزار ٹیم اور چند لاکھ روپیوں کی فراہمی سے یہ سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ تلنگانہ علیحدہ ریاست کا مسئلہ سامنے آتے ہی ملک گیر پیمانے پر برسوں سے التوا میں پڑے ہوئے مزید چھوٹی ریاستوں کی تشکیل کے سوالات بے حد زور پکڑ چکے ہیں، ملک کے کئی علاقوں بالخصوص مغربی یوپی کے جانثاران اردو نے ''اردو پردیش'' کا پرزور اور مبنی بر انصاف مطالبہ پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس مسئلے پر دانشوران اردو کو مل بیٹھ کے دستور ہند اور ریاستوں کی تشکیل کی لسانی بنیادوں کی روشنی میں معقول منصوبہ بندی پہلی فرصت میں مکمل

کر لینی چاہیے ہم آپ کی دعاؤں اور دواؤں کے خواہاں اور منتظر ہیں۔

؎ جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
(اقبالؔ)

باب سوم

تاثرات

ادبیات محمود (دوم) پر ایک نظر

''ادبیات محمود'' (اول) اور دیگر کئی تصانیف کے مصنف ڈاکٹر محمود حسن الہٰ آبادی صاحب کے ادبیات (دوم) کا مسودہ اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ہے جو ادبی مقالات، تبصرے اور معروف علمی و ادبی شخصیات پر تقریباً دو درجن مقالات و مضامین پر مشتمل ہے۔ موصوف اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اعلیٰ ترین اسناد کے حامل ہی نہیں فاضل طب کی تکمیل کے بعد رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر بھی ہیں۔ اور ۱۹۶۶ء سے بھیونڈی میں مقیم ہیں۔ اس کے باوجود کسر نفسی کا یہ عالم کہ:

''بدقسمت تھا کہ نہ دینی تعلیم مکمل ہوئی نہ طبی اور نہ ہی عصری تعلیم، بنور طفل مکتب ہوں''۔

یہ خاکساری تکلفاً نہیں ہے بلکہ ان کے دینی و تحریکی مزاج و ماحول، ہمہ جہتی مطالعہ اور وسیع تجربات کی بھٹی نے انہیں تپا کر اس مقام تک پہنچایا ہے۔ اسی وجہ سے میں انہیں سکہ بند ناقد و محقق کے بجائے ایک فطری، خود رو، قدر شناس دانشور اور ادب نواز تصور کرتا ہوں۔ چنانچہ ان کا کوئی مقالہ یا تبصرہ دیکھیے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس موضوع کی تعریف، بنیادی مسائل، اہم نکات اور اس موضوع پر کہیں کوئی اور کام ہوا ہو تو اس کا تذکرہ، اور موازنہ پیش کرتے ہوئے معلومات کا ایک خزانہ اکٹھا کر دیتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مقالات پر قاموسی یا تاریخی طرز اظہار کے ساتھ تعمیری و اخلاقی نقطۂ نظر حاوی رہتا ہے۔ اس لیے ان کا قاری ان کے مقالوں کی بعض جگہ طوالت سے اکتاتا نہیں بلکہ معلومات افزا مواد و نکات سے مسرت سے بصیرت تک کا سفر طے کرتا رہتا ہے۔

اس مجموعہ میں ''ادب اور اخلاق'' کے موضوع پر ایک مفصل اور دوسرے دو

مضامین شریک اشاعت ہیں۔ادب میں اخلاق کا موضوع عہد بوطیقا سے آجتک زیر بحث ہے"۔"ادب اور اخلاقیات" کے زیر عنوان مقالہ نگار نے آغاز کلام قرآن کریم کی ایک آیت سے کیا ہے مگر یہودی، عیسائی، اسلامی، گاندھیائی نقاط نظر کے حوالوں کے علاوہ مختلف اخلاقی تحریکات مثلاً لذتیت، افادیت، ابی قوریت، کلیت، مشائیت اور رواقیت وغیرہ کے تذکروں کے بعد ادب میں مذہب واخلاق کی ضرورت واہمیت کے ذیل میں تین بنیادی سوالات کے منطقی اور قرآنی جوابات سے قارئین کو سرشار کیا ہے۔

"ادب میں اخلاق" ایک مختصر مگر دلچسپ مضمون ہے جس میں ایک ادیب کے مریضانہ تصوف کا بخیہ ادھیڑ کر مسکت جواب دیا گیا ہے۔اسی طرح "ادب پر تصوف کے اثرات" میں تصوف کے اہم ترین مسائل اور تصانیف پر سیر حاصل روشنی ڈالنے کے بعد آخر میں جملہ مسائل کو سہ نکاتی مواد میں سمیٹ لیا ہے۔البتہ میر اور اکبر کے تصوف پر موصوف نے جو کلام کیا ہے اس پر کسی کو بھی اختلاف کا حق ہے۔

"داستان اور ادب عالیہ میں اس کا انعکاس" مصنف کے قاموسی طرز تحقیق وتنقید کی ایک عمدہ مثال ہے۔ادب عالیہ کے علاوہ قرآن کے حوالے سے ۱۷ احادیث کے حوالے سے ۱۱ قصص کو داستانوں کی صف میں شامل کر کے دس نکات کی بنیاد پر جو حاصل مطالعہ پیش کیا ہے وہ مصنف کی اسلامی اور ادبی حکمت وبصیرت کا بین ثبوت ہے۔

"خلیق الزماں نصرت کی تنقید نگاری" میں مصنف کی ناقدانہ بصیرت میں شخصی تاثرات کی بکھری ہوئی چاندنی معنویت وحلاوت میں اضافہ کا سبب ہے۔چار علمی وادبی شخصیات جو مصنف سے نسبتاً قریب رہے ہیں ان پر دلکش مضامین بھی پیش ہوئے ہیں۔ایک درجن سے زاید مختلف النوع تصانیف پر ان کے دلچسپ تبصرے بھی منفرد انداز کے ہیں۔ڈاکٹر صاحب موصوف کے یہ تبصرے اور مقالات ملک اور بیرون ملک کے موقر اردو رسائل واخبار کے علاوہ "اردو بک ریویو" کی بھی زینت بنتے رہے ہیں۔اردو دنیا کے

معروف ماہر اقبالیات معتبر محقق وناقد پروفیسر عبدالحق صاحب کی تین اہم تصانیف پر تبصروں کے علاوہ، تعلیمی، شعری مجموعے، سفرنامے اور دیگر موضوعات پر جو تبصرے ہیں ان سے ان کتابوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور قارئین، مصنفین کی منشائے تحریر کی روح تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسن صاحب کے اسلوب بیان میں بے تکلفی اور سلاست وفصاحت کے علاوہ بڑی جامعیت پائی جاتی ہے۔ مافی الضمیر کی ادائیگی میں موصوف جابجا حسین شاعرانہ انداز بیان سے بھی کام لیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مصنف موصوف کی جملہ تحریروں اور مشاہیر ادب کے ساتھ ان کی جو مراسلت ہوئی ہے ان سب قیمتی مواد پر زندہ دلان مہاراشٹر توجہ فرمائیں اور ان کی اشاعت سے علم وادب کے نئے چراغ روشن کریں۔

آنکھ اور اردو شاعری

ماہر چشم ڈاکٹر عبدالمعز شمس کی تازہ مرتبہ کتاب ''آنکھ اور اردو شاعری'' کو میں اردو میں ایک انوکھی کتاب اس لیے سمجھتا ہوں کہ موصوف نے اس میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو ادبی دیدہ وری میں تبدیل کر کے ایک انوکھا کارنامہ انجام دیا ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ یوں تو ہر انسانی عضو قدرت کا ایک کرشمہ ہے، لیکن آنکھیں تو انمول خزانہ ہیں۔ آنکھوں کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ آنکھ سے آنکھ ملتے ہی ''من کی بات کو لاتی ڈھونڈ نکال''۔ شاید اسی لیے ''ایک مفکر نے انہیں روح کا دروازہ'' کہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب قانونی دستاویزات پر مہر کے ساتھ دستخط ہوا کرتے تھے، آگے چل کر انگلیوں کے نشانات لیے جانے لگے۔ اب آنکھوں کی پتلیوں کے نقش لینے کا سلسلہ چل پڑا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمعز شمس کی اس ''دیدہ وری'' میں ایسا لگتا ہے کہ کسی تیر نیم کش کی خلش کو جگر مرادآبادی کی طرح انہیں بھی جھیلنا پڑا ہے، ورنہ ایسی دل کش تصنیف کا منظر عام پر آنا آسان نہ تھا۔

؎ آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی، جگا کر چلے گئے

لگتا ہے معاملہ اس سے بھی آگے کا تھا:

؎ ذرا سی دیر کو آئے تھے خواب آنکھوں میں
پھر اس کے بعد مسلسل عذاب آنکھوں میں

چنانچہ راقم الحروف کی طرح اس کتاب کے دیگر قارئین بھی مصنف کی شب

بیداری، کو مومنؔ ہی کی طرح ناڑ جائیں گے کہ

آنکھ نہ لگنے سے، شب، احباب نے　　آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

معز جواباً مومنؔ ہی کے اس شعر کو پیش کر دیں تو چہ میگوئیاں کرنے والے کی زبان بند ہو سکتی ہے:

آنکھ لگتے ہی ناصح! کچھ نظر نہیں آتا　　گر یقیں نہیں حضرت! آپ بھی لگا دیکھیں

عبدالمعز کو راقم چونکہ پچھلے پچاس برس قبل ان کی طالب علمی کے زمانے سے بخوبی جانتا ہے اس لیے مڈیکل تعلیم ہی کے دوران ادب و شاعری سے ان کا والہانہ لگاؤ، ان کا ذوق جمال، ادبی مزاج، علم کے ساتھ محنت و عمل کے خوگر اور ہر خدمت خلق کے کام کو اخلاص و ایثار کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا جذبہ ہمیشہ توجہ کش رہا۔ مگر مومنؔ کی اس "پیشین گوئی" کے برعکس ڈاکٹر عبدالمعز نے اپنی بصارت ہی نہیں بصیرت کو بھی محفوظ رکھا اور اپنی سلامتی طبع نیز فکر رسا سے آنکھوں کے نیل گگن میں ڈوب کے وہ وہ در نایاب نکال لائے کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ آنکھوں سے متعلق اردو شاعری بیشتر اسی طرح کی حسن ظاہری کی والا و شیدا رہی ہے۔ جسے اقبال نے 'نادانی' سے موسوم کیا ہے۔

؎　میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری

ایسے نادانوں اور غافلوں کو اقبال دیدۂ عبرت سے کام لینے اور دل بینا کے لیے دعا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اس لیے کہ

؎　ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کرد ست غافل در نگر

؎　دل بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

شاعر مشرق نے اپنے مخصوص انداز میں مسلسل نوجوانوں کو انقلابی پیغام دیا ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا بڑے بڑے انقلابات سے دوچار ہو کر "کیا سے کیا ہو جانے والی ہے" لہٰذا

؎ کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

مگر اس انقلابی ماحول میں آنکھ کا تارا بننے والے جوان کی خاصیت اس طرح بتائی ہے:

؎ وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ اور ضرب ہے کاری

اور اصغر گونڈوی کا یہ نعرۂ قلندرانہ دیکھیے:

بند ہو آنکھ ہے منظر قدرت کا حجاب لاؤ اک شاہد مستور کو عریاں کر دیں

اسی طرح میر، سودا، نظیر، غالب، شاد، فیض، مجاز، شہریار، اختر شیرانی، ناصر کاظمی، علی سردار جعفری (تمہاری آنکھیں نظم ص ۱۰)، پروین شاکر (وہ آنکھیں کیسی ہیں۔ نظم ص ۱۶) وغیرہ کے درجنوں اشعار مختلف عنوانات کے تحت پیش ہوئے جن کے سرسری مطالعہ سے بھی ہر شاعر کی انفرادیت اور اس کی مخصوص پہچان نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگر غور کریں تو غیر شعوری طور پر ڈاکٹر معز نے نامور اردو شعرا کے مجموعہ ہائے کلام سے درجنوں اشعار نقل کر کے تقابلی مطالعہ کا قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے۔ اس طرح کے مطالعہ کی خوبی یہ ہے کہ پھیلے ہوئے موضوعات و مسائل کے بجائے ایک مخصوص انسانی عضو (آنکھ) پر ہر شاعر کے فکر و فن کی گہرائی و گیرائی اور انفرادیت کو جانچنے اور پرکھنے کے وقت ارتکاز و استحضار کے حصول میں ناقد کو جو سہولت و وضاحت نصیب ہے وہ کسی دوسرے طریقے سے اس قدر ممکن نہیں۔ یوں بحیثیت مجموعی اردو شاعری کے فکر و فن میں تنوع اور کائناتی وسعت پذیری اور

تہداری کا اندازہ لگانا بھی سہل تر ہو جائے گا۔ شوکت واسطی کی نظم ''آنکھیں'' کا محض ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ان میں شعلوں کی لپک، ان میں پتنگے کا سرور
ان میں تتلی کی تڑپ، ان میں گل تازہ کا نور

''آنکھ اور اردو شاعری'' میں معز نے آنکھ سے متعلق اشعار کی محض کھتونی نہیں کی ہے بلکہ شعر و سخن کے مختلف رنگ و آہنگ سے جو نور و سرور میسر ہوتا ہے۔ آنکھ کے حوالے سے ان مختلف پہلوؤں کی عالمانہ و ناقدانہ انداز میں پہلے وضاحت کی ہے پھر مثالوں کے انبار لگا دیے ہیں۔ یوں یہ تصنیف نظری و عملی دونوں اعتبار سے ہمہ جہت و ہمہ صفت کہے جانے کے لائق ہے۔

پوری کتاب اصلاً دو حصوں یا ابواب میں منقسم ہے۔ پھر دونوں ابواب میں کئی کئی اجزا بھی ہیں۔ باب اول کا نام ''شعری محاسن'' رکھا گیا ہے جو ۱۱۱ صفحات پر مشتمل ہے اور باب دوم کا نام ''شعری موضوع'' دیا گیا ہے۔

باب اول (شعری محاسن)، حرف آغاز کے علاوہ محاوروں، ضرب الامثال اور کہاوتوں کے تعلق سے پانچ اجزا پر مشتمل ہے۔ موصوف نے حرف آغاز میں شعر کی ماہیت و اہمیت بیان کرتے ہوئے لفظ، جذبات، تخیل، تشبیہ و استعارے نیز بیان و بدیع کی لگ بھگ تمام اہم صنعتوں کی وضاحت مع شعری امثال پیش کی ہے۔ اس کے بعد ''آنکھوں سے متعلق محاورے'' (ص ۱۲ تا ص ۲۶) کے ذیل میں ڈھائی سو سے زاید محاورات مع معنی کا اندراج کیا ہے۔ اسی باب کے ایک جز ''آنکھ۔ محاوروں کے جلو میں'' ۱۵۲ محاورات (ص ۲۷ تا ص ۹۴) مع امثال اشعار اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کی دل چسپی شروع سے آخر تک

برقرار رہتی ہے کیونکہ اشعار کے انتخاب میں نامور شعرا کے معیاری کلام ہی کو منتخب کیا ہے۔ اسی باب (ص ۹۵ تا ص ۱۰۸) میں ''آنکھ اور تشبیہات'' کے ذیل میں ۴۲ خوبصورت اشعار کا ایک گلدستہ ایسا سجایا ہے کہ قاری ہر شعر کو لطف لے لے کر پڑھتا جاتا ہے۔ اس کے آگے ''آنکھ اور ضرب الامثال نیز کہاوتیں'' کے زیر عنوان پہلے ان کی حقیقت و ماہیت کی مختصر وضاحت کے بعد بیس ضرب الامثال پر مشتمل اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

ص ۱۱۴ سے اس دلچسپ کتاب کا دوسرا اور آخری باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ''شعری موضوع'' دیا گیا ہے۔ اس حصے میں بھی مرتب کی خوش ذوقی، سخن فہمی اور بصیرت افروزی کے ساتھ ان کی محنت شاقہ قابل داد ہے۔ اس جزو کے اولین پینتیس صفحات میں تمہید کے بعد سراج، نظیر، غالب، حسرت، محسن، علی سردار جعفری، فراق، بشیر، افتخار، منیر نیازی وغیرہ کے معیاری شعرا کی حمد، نعت، دوہے، غزل، رباعیات اور شاہکار نظموں کا انتخاب پیش کیا ہے۔

اس آخری حصے میں مصنف نے کمال یہ کیا ہے کہ 'لفظ 'آنکھ' سے شروع ہونے والے اشعار'' کو یکجا کیا ہے، جس میں دور قدیم سے جدید تک کے اہم ترین اکتیس شعرا کے تقریباً دو ہزار عمدہ اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اہم شعرا میں سراج، میر، سودا، درد، نظیر، ذوق، مومن، شاد، اکبر، اقبال، حالی، حسرت، جگر، فانی، فیض، فراق، کلیم عاجز، ناصر کاظمی، پروین شاکر، احمد فراز وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔ یہاں بھی اس حصے کی اہمیت و معنویت پر بعنوان 'تمہید' تھوڑی سی روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد لفظ آنکھ سے شروع ہونے والے اشعار کو آخری صفحہ ۸۷ تک پیش کیا گیا ہے۔ مرتب نے کوشش یہ کی ہے کہ خوب

صورت اور معنی آفریں اشعار شریک انتخاب رہیں۔اس لیے بعض بعض شعرا کے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے۔مثلاً میرؔ کے ۱۷۶ اشعار ہیں تو جگرؔ کے ۱۹۔انیسؔ کے ۱۷ تو دبیرؔ کے ۱۴، مومنؔ کے ۹ تو سوداؔ کے ۱۶ اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ان میں علی سردار جعفری کی ''تمہاری آنکھیں'' (ص۱۰) اور پروین شاکرؔ کی ''وہ آنکھیں کیسی ہیں؟'' (ص۱۹) جیسی شاہکار نظمیں بھی شریک اشاعت ہیں۔

غرض ایک ماہر چشم نے محض اپنے ذوق شعروادب، توازن فکر اور انتھک محنت سے آنکھوں سے متعلق اردو شاعری کا ایک ایسا انمول گلدستہ سجایا ہے کہ ماضی میں جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔اس کامیاب ادبی و تحقیقی کاوش پر ڈاکٹر عبدالمعز شمس تحسین و تشکر کے مستحق ہیں۔

نعت نبیؐ کی نئی جہتیں

"نعت نبیؐ کی نئی جہتیں" کے زیرِ عنوان ایک مختصر سے مجموعہ کا مسودہ اس وقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے۔ جس کے تخلیق کار اردو دنیا کے مشہور و معروف شاعر و ادیب، محقق و نقاد علیم صبا نویدی ہیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ علیم صبا اپنی شعری و نثری تخلیقات میں گھسے پٹے موضوعات کے بجائے ہمیشہ نئے نئے موضوعات و عنوانات کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس لیے بجا طور پر وہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نعتیہ شاعری اردو میں اب ایک مقبول و محبوب صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ اب ملک اور بیرون ملک میں نعتیہ مشاعروں کا بھی سلسلہ چل پڑا ہے۔ اہل نظر کے علم میں ہے کہ صنف نعت چونکہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ سے قلبی تعلق و محبت کا شعری اظہار ہوتی ہے اس لیے بعض اوقات اس کی نزاکت اور آداب 'حمد' سے بھی فزوں تر ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض شعرا خدا و رسول کے فرق مراتب سے ناواقفیت یا جوش و جذبات میں ایک دوسرے کے مرتبے کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور شرک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

علیم صبا نے بڑی خاکساری کے ساتھ رسول کریمؐ کے حضور اپنی نظم "ندامت" میں اظہار شرمندگی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے والدین اور خاندان میں "عبادتوں کی خوشبوئیں" اور "درود کی کرنیں" ہر جگہ ہر وقت چھائی رہتی تھیں مگر اس ماحول میں ان کی ذات "غلاضتوں کی دلدل میں دھنسی" ہوئی تھی۔ بالآخر اپنی خودی کو مسمار کر کے تائب

ہوئے تو گویا ان کا ''دوسرا جنم'' ہوا تو گھر کا گھر ششدر رہ گیا اور اب ان کی آنکھوں میں ''تجلیوں کی ایک نئی کائنات'' اور درود مصطفیٰ کی مقدس آواز کی گونج تھی۔

بیشتر آزاد نظمیں مختصر ہیں مگر ان میں جو سرشاری اور سرمستی ہے وہ صوفیانہ بے خودی و بے کرانی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شاعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سرشار کیفیت میں بھی اس نے حفظ مراتب کا پورا خیال رکھا ہے۔ ''مقام لا'' میں بھی اس کی ''آرزو'' یہ ہے کہ

میں خاک زاد ہوں
آپؐ سراپا نور کونین
تھوڑی سی روشنی سہی
مل جائے بھیک میں

حب رسولؐ کے انتہائی احساسات و جذبات کو شاعر نے تقریباً ہر نظم میں ''نور اور خوشبو'' کے مختلف الفاظ و اشارات کو بڑے جذب و مستی کے عالم میں پیش کیا ہے۔ مثلاً

''ایک چہرۂ نورانی، سراپا قرآنی، ذات اقدس کے جلووں، سراپا منور، نورانی اجالا، خوشبو کا ذائقہ، نورانی ملبوس، نورانی پتلیاں، روشن زباں، جلوہ فشاں، نورانی لمحات، سرمست مہکتی شام، نور نبیؐ، نورانی دعائیں، روشن کائنات، معطر لمحات، نوری کرنوں سے منور، نورانی چہرہ، پرنور آنکھیں، نورانی سفر، صد جلوہ گاہ طور، مصطفائی کرن، صبح نورانی، نئی روشنی، روشنی کے بھید، نورانی پیکر قرآنی نور''۔

ان علامتوں میں شاعر کا جذب دروں جھلکا پڑتا ہے۔ اس نے ''مصطفائی تہذیب'' اور ''شعر مصطفیٰ کے ذریعہ'' قرآنی نور، عرفان ذات اور ''یہ شہر پھول والوں کا ہے'' کہہ کے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے۔ مگر باانداز شاعرانہ کہ یہی عمدہ شاعری کی پہچان ہے۔ علیم صبا کا اسلوب بڑا پہلودار اور جامع ہے، جہاں جن کیفیات و احساسات کو ظاہر کرنا چاہیں ان

کے لیے موزوں ترین الفاظ ان کے خامہ پرنور سے جگی ریز ہونے لگتے ہیں۔

واضح ہو کہ ذات اقدس کی قدامت اور "نور محمدی" کے متعلق اکابر صوفیا نے اس کا مختلف انداز سے تذکرہ کیا ہے۔ مشہور صوفی اور فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن العربی (۱۱۶۵ء-۱۲۴۰ء) سے بہت پہلے ہی حضور کریم کی ہستی کی قدامت کا عقیدہ تسلیم کیا جا چکا تھا، جس کے مطابق اللہ نے جس کو سب سے پہلے پیدا کیا وہ نور محمدی ہے جو آدم میں آیا اور نسلاً بعد نسلاً تمام پیغمبروں میں ہوتا ہوا بالآخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوا۔

علیم صبا کو حسب موقع الفاظ و اسلوب کو فنکارانہ انداز میں برتنے کا سلیقہ آتا ہے اسی لیے مختصر نظموں اور بحروں کے آزادانہ استعمال کے باوجود ہر نظم موثر اور دل نشیں ہے۔ شاتم انبیا یا جہاں حب رسول کے برخلاف گستاخان رسول کا تذکرہ آجائے تو وہاں علیم صبا کے زبان و بیان کی غضبناکی و قہرمانی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ مثلاً "محروم فیضان رسول" اور "شہر مصطفیٰ" کو دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر نے اشارے کنائے میں ذات اقدس کی سیرت کے بعض پہلوؤں اور تاریخی واقعات کی طرف تو کم کم اشارے کیے ہیں مگر عشق رسولؐ میں وارفتگی اور نور الٰہی کے سیلاب جگی کا بڑے موثر انداز میں جابجا اظہار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کی نعتیہ شاعری میں "نعت نبی کی نئی جہتیں" اسم با مسمیٰ کی حیثیت سے منظر عام پر آئی ہے۔ اور عاشقانہ رسول کے لیے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔

''ڈیڈسی''۔ایک تاثر

شہاب دائروی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''ڈیڈسی'' اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔موصوف نصف صدی کے زائد عرصہ سے پرورش لوح وقلم میں مصروف ہیں۔اس دوران ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ابہام واہمال کی کئی جان لیوا لہریں اردو افسانے کے سر سے گزر کے اس کے مستقبل پر کئی سوالیہ نشان چھوڑ گئیں۔شہاب دائروی کے فکروفن کے نظم واستحکام کی ایک دلیل یہ ہے کہ موصوف کسی سکہ بند ''تحریک یا لہر'' سے بے نیاز اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے،اس لیے سکہ بند ناقدین نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا فنکار کا یہ شکوہ غلط نہیں کہ ''آج کے نقاد کسی فن پارہ کی جانچ و پرکھ ایمانداری کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ تعلقات اور دوسروں کے خیال ونظر ہی کو روا رکھتے ہیں۔'' (کہانی سے پہلے ص ۱۱)

سچ تو یہ ہے کہ جس زمانے میں اردو مختصر افسانہ نام نہاد جدیدیت اور ابہام واہمال کے طوفان بلا سے جوجھ رہا تھا شہاب دائروی ان چند افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے اس فن کے کہانی پن اور افسانویت کو بیابان مرگ میں جانے سے روکا کیونکہ وہ اپنے افسانوں میں 'عصری حالات وکیفیات اور اپنے مشاہدات وتجربات کو' فنی نک سک سے بنا سنوار کے پیش کرتے رہے۔ان کی کہانیوں میں جامعیت کے باوجود جو جزیات نگاری اور باریک بینی پائی جاتی ہے اس کا اعتراف ہر اہل نظر کو ہے۔

ان حقائق کے باوجود بعض ناقد اپنے نظریاتی تحفظ خانوں میں بیٹھ کے ان سے شکوہ سنج ہیں کہ ان کے یہاں ''نئے تجربے کی آنچ نہیں'' ''ان کے افسانوں میں فکر ونظر کی عمیق دنیا'' ندارد ہے'' رموز وعلائم نہیں جبلت کا پاس ہے'' ''نئی پیچیدگی اور ابہام سے

لاتعلق''محض ''تفریحی''نوعیت کے افسانے ہیں۔اور بطور ثبوت زیر بحث مجموعہ کے صرف اولین افسانہ جو اس کتاب کی وجہ تسمیہ بھی بنا یعنی ''ڈیڈی'' کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں ایک نوجوان التمش کا ایک کنواری لڑکی خالدہ کے زیر نگرانی کام، عشق، شادی، بچوں کی پیدائش، عمر کے ساتھ اس کی جسمانی کشش میں کمی، التمش کی لاتعلقی اور ایک نوجوان ملازمہ سے جنسی ربط'' کو بطور ثبوت پیش کیا ہے۔مگر اس مجموعہ میں جو دوسرے تمام افسانے ہیں ان کا کہیں ذکر تک نہیں آیا۔جبکہ ''سوتیلی ماں'' میں ایک مغرب زدہ خاتون کی مسخ شدہ جنسیت''لاج'' میں ایک خاتون کی ہمت وجرأت ''پرکھ'' میں دولت کی ہوس اور مادہ پرستی'' چہرے'' میں عین فساد کے ابلیسی رقص کے موقع پر ایک دشمن نوجوان کی فرشتہ خصلتی ''امن کا پہلا پڑاؤ'' میں کشمیر مسئلہ پر ہندوپاک کی طویل کشمکش اور امن بنام دہشت گردی کے سلگتے ہوئے مسئلے پر ایک موثر افسانہ پیش کیا گیا ہے''انسانیت'' میں اخلاقی قدروں سے قائل و متاثر ہونے کے بعد ایک نوجوان اپنے باپ کے قاتل کو بھی معاف کردیتا ہے۔'' آوارہ خط'' میں صحافت وسیاست کی بددیانتیوں کا پردہ فاش کیا گیا''سچا رشتہ'' میں کڑے وقت پر ہندو مسلم دوستی اور بھائی چارے کی ولولہ خیزی''ایثار'' میں ایک سوتیلی ماں کے جذبہ ایثار اور ''خلش'' میں ایک نوجوان فوجی افسر کا وطن کی قربان گاہ پر خود کو بھینٹ چڑھا دینے کا جرأت مند واقعہ پیش کیا گیا ہے۔غرض تمام ہی افسانوں میں حیات وکائنات کی مختلف گتھیوں اور مسائل کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔''ڈیڈی'' میں بھی جبلت جنس کے ایک پہلو کو بڑی خوبی سے منظر عام پر لایا گیا ہے۔اس لیے راقم الحروف کے خیال میں افسانہ کی سرخی ''ڈیڈی'' جسے پوری کتاب کا نام بھی دیدیا گیا۔اس سے مغالطہ اس شخص کو ہوسکتا ہے جو بقیہ سلہ خوبصورت افسانوں سے قطع نظر کرکے صرف ایک افسانہ کو پوری کتاب کی کلید اور اس کا بنیادی تصور ثابت کرنے پر تلا ہوا ہو۔

شہاب دائروی کے فن کا ایک نمایاں پہلو ان کے انداز بیان کی جامعیت اور

اشاروں اشاروں ہی میں پوری بے تکلفی سے جابجا بہاری روزمرہ کے الفاظ ومحاورات میں اپنے مافی الضمیر کی پیشکش ہے مثلاً "ڈیگا ڈیگی، جگ جگ جیو، کٹوریوں اور بٹورنا" وغیرہ۔ ایک اقتباس سے شہاب کے اسلوب بیان کی معنویت وسلاست کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

> "قدرت انسان کو ٹیڑھی میڑھی راہوں پر ڈال کر، نیا نیا موڑ بخش کر، اس کے حوصلے کی پختگی اور عزائم کا امتحان لیتی ہے، جو اپنی ہمت بٹور کر آگ کے لاوا اور پانی کے بہاؤ کے بیچوں بیچ گزر جاتے ہیں۔ وہ کندن کی طرح چمک اٹھتے ہیں اور جو حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں، وہ ڈوب جاتے ہیں۔" (خلش ص ۱۳۸)

لہذا صرف "ڈیڈی" پر جملہ افسانوں کو قیاس کرنا نقد ونظر کی کتابی کہا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تب ان کے جملہ افسانوں کو شاہکار قرار دینا بھی مبالغہ ہوگا بعض افسانے پر تکنیکی اور فنی نقطۂ نظر سے کڑی نظر ڈالی جائے تو ان کی خامیاں بھی سامنے آسکتی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی "ڈیڈی" شہاب دائروی کے فکر وفن کا ایک خیال انگیز اور پر کشش افسانوی مجموعہ ہے۔

قندیل رہبانی۔ ڈاکٹر ظفر عالم سہسرامی

دیگر علوم وفنون کے مقابلے میں ادب وشاعری کی دوہری قوت تسخیر یعنی اولاً فکری قوت اور دوم جمالیاتی لطافت کے سبھی قائل ہیں۔ مگر ان میں توازن برقرار رکھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر ظفر عالم سہسرامی بڑے خوش بخت ہیں کہ قدرت نے انہیں اس دوہری قوت سے نوازہ ہے۔ مزید یہ کہ وہ عمر بھر معلم، محقق اور مربی کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ان کے فکر وفن میں مسرت سے بصیرت تک کا وافر سامان بھی بیک نظر ان کا ہر قاری بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ ''قندیل رہبانی'' کی ان سترہ نظموں کے اس مختصر سے انتخاب میں بحیثیت مجموعی یہ دونوں خوبیاں واضح ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض نظموں میں ان کی فکری قوت کی لے تیز تر ہوگئی ہے مگر بیشتر مقامات پر انہوں نے لفظ کی شعری قدر وقیمت اور اس کی تاثیر کو اپنے اصلاحی وانقلابی خیالات پر حاوی رکھا ہے۔

ان نظموں میں شاعر نے اپنی ذات سے لیکر بعض احباب، محسن شخصیات، اپنے مقصد زندگی، حب خدا اور رسول اور حیات وکائنات تک کی جذباتی وروحانی کیفیات کو پرتاثیر انداز میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انداز بیان میں روایت کے ساتھ وہ جدت کے قائل ہیں اس لیے پابند کے ساتھ آزاد نظم نگاری کی ہے۔ خوب صورت تشبیہ واستعارے اور اشارے کنائے میں اپنے مافی الضمیر کو تہدار بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو موصوف فکری اعتبار سے اقبالؔ اور فنی اعتبار سے فیضؔ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ توقع ہے کہ انہوں نے اس خداداد شعری صلاحیت پر اگر مزید توجہ دی تو جدید شعری سرمائے میں وہ قابل لحاظ اضافہ کر سکتے ہیں۔

سوئے حرم۔ایک مطالعہ

مولانا شریف احسن مظہری کا مسودہ "سوئے حرم" اس وقت پیش نظر ہے۔ "نعتیہ شاعری" کی طرح اردو میں "سفر نامۂ حج" بھی اب ایک مسلمہ صنف کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔صدیوں سے مختلف مشاہیر اور ادیبوں نے اس موضوع میں یادگار تخلیقات پیش کی ہیں۔عام سفرناموں کے مقابلے میں بظاہر سفر حج کا دائرہ محدود ہے کہ یہاں وہ جغرافیائی وظاہری وسعت اور تنوع نہیں مگر یہاں دل کی دنیا بے حد وسیع اور آفاقی انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے اس لیے شہر صرف دو ہیں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جو دو ہستیوں سے منسوب ہیں خدا اور رسولؐ۔مگر ہر حاجی کی دلی و روحانی تمناؤں اور عمر بھر کی آرزوں اور ارمانوں کا ماویٰ وملجا بن کے یہ چاروں اجزا ایک کل میں تبدیل ہوجاتے ہیں،جن کے بیان میں جذب وکیف اور سرمستی وسرشاری کی عجیب وغریب کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

ہر حاجی چونکہ مختلف علاقے ، الگ الگ خاندانی پس منظر اور منفرد ذوق و صلاحیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے سفر کا مقصد عبادت صرف ایک ہوتے ہوئے بھی ہر حاجی کے دلی احساسات وجذبات اور تخیلات وادراک میں بین فرق واقع ہوتا ہے، چنانچہ تقاضائے ایمان کے تحت تزکیۂ نفس اور روحانی بالیدگی کے لیے جب وہ اس عظیم عبادت الٰہی کے لیے مختلف مراسم ومراحل سے گزرتا ہے تو ہر فرد کی کیفیات قلبی بالکل مختلف ہوجاتی ہیں۔دوسری خاص بات یہ ہوتی ہے کہ کسی ادبی تخلیق کے لیے جس سوز وگداز اور جذب دروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر حاجی کو سفر حج کے روز اول سے حسب ذوق وظرف میسر ہوتی جاتی ہے۔اس لیے سفر نامہ نگار جب اپنے تجربات واحساسات کو سپرد قلم کرتا ہے تو اس کا جذب واخلاص اس کی تحریر کو موثر ہی نہیں موثر بھی بنادیتی ہے۔

مصنف عالم باعمل ہیں یعنی زندگی بھر پیشۂ معلمی سے جڑے رہے اس لیے عالمانہ تجسس وتعبیر کی خوشبو پورے سفرنامہ میں ہر جگہ محسوس ہوتی ہے چھوٹے چھوٹے واقعات و مناظر سے بھی موصوف نے ایمان افروزی کشید کی ہے۔ دوران حج مکہ اور مدینہ میں ہر حاجی صبح سویرے سے دیر رات تک مختلف عبادات، طواف وزیارہ اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتا ہے۔ لہٰذا ہر معاملہ یا مسئلہ کی تفصیل میں جانے کی گنجائش بہت کم رہتی ہے اس تنگی اور رواروی کے باوجود موصوف نے اپنی عربی وانگریزی دانی اور اشاروں کنایوں میں ترکی، الجزائری، مصری، انڈونیشیائی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی حجاج سے اپنے کام کی باتیں کرتے رہے۔ اس ضمن میں سلطنت خداداد پاکستان اور ہندوستان کے مجموعی حالات کا دلچسپ موازنہ بھی پیش کیا ہے۔ ہر سال عالمی پیمانے پر دنیا کی سب سے جلیل وکثیر تعداد (تقریباً ۴۰۔۵۰ لاکھ) کی ایک ماہ تک جملہ ضروریات خوردونوش، نقل وحمل، عبادت و ریاضت، علاج معالجے، صفائی ستھرائی اور نظم ونسق کا انتظام ایک غیر معمولی اور حیرت انگیز کارنامہ ہی قرار دیا جائے گا۔ مصنف نے اس ضمن میں سعودی حکومت کی بجا طور پر جابجا تحسین وتوصیف کی ہے۔ البتہ سعودی عرب میں مزدوروں اور ہندوستانیوں کا جس طرح استحصال اور ان کی تذلیل کی جاتی ہے اس پر گرفت بھی کی ہے۔

بڑی انکساری کے ساتھ جابجا اپنی بعض کمیوں اور کمزوریوں کا اعتراف اور مختلف واقعات سے عبرت آموزی ومطائباتی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ تحریر پرلطف اور دلکش ہوگئی ہے۔ موقع موقع سے اردو فارسی کے موزوں اشعار سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں۔ حج کے اس سالانہ عالمی اتحاد واجتماع کے جسمانی وروحانی تربیتی پروگرام کے باوجود سارے جہان میں امت مسلمہ کے درمیان انتشار وافتراق پر مصنف نے بجا طور پر اظہار حیرت وحسرت کیا ہے۔

دوران حج، مقام ابراہیم، مطاف ومسعیٰ اور حطیم، منیٰ، مزدلفہ اور جمرات وغیرہ

کے دوران چلتے چلاتے جو چھوٹے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں انہیں بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے، انہیں بوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ ایک بار موصوف جمرات سے واپسی میں اپنی اہلیہ سے بچھڑ گئے تو اپنی بے حد تشویش اور پریشانی کا ذکر بھی خاص انداز سے کیا ہے۔ موصوف اردو صحافت اور انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ سے بھی عرصہ تک وابستہ رہے ہیں چنانچہ "حجاز میں اردو" کے زیر عنوان اردو کی عالمی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مکہ اور مدینہ دونوں شہروں کے اہم مقامات سے وابستہ تاریخی واقعات کو اشاروں اشاروں میں موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے، بالخصوص غار ثور اور غار حرا کے حوالے سے انسانی تاریخ وتہذیب کے ارتقا میں پہاڑی غاروں کی اہمیت کا بیان دلچسپ اور خیال انگیز ہے۔

دوران سفر اسلامی تاریخ کے بعض اہم واقعات کو کہیں اشاروں اور کہیں قدرے وضاحت کے ساتھ عبرت انگیز انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بالخصوص مدینہ میں ایک غزوہ کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر بعض انصار کو جو غلط فہمی ہوئی تھی اس کا ازالہ حضور کریمؐ نے جس موثر حکمت خطابت سے کیا اسے تاریخ انسانی کا ایک بیش بہا کارنامے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مصنف نے اس تاریخی خطبہ کو عربی کے علاوہ اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کر کے اس سفرنامہ میں چار چاند لگا دیا ہے۔ زبان وبیان صاف وشستہ اور سلیس وفصیح ہے۔

واپسی پر احباب واعزا کا اژدہام اور ان کے خلوص ومحبت کی فراوانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملک بھر میں مسلم نوجوانوں کو دہشت گرد قرار دے کر مشق ستم بنانے کے واقعات پر بجا طور پر اظہار تشویش کیا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں "سوئے حرم" ایک مختصر سفرنامہ حج ہوتے ہوئے بھی اسے اردو کے اہم سفرناموں میں شمار کیا جائے گا۔

اجالوں کے سفر کا راہی۔ یوسف راز

جدید شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مقام پر خلیل الرحمن اعظمی نے کہا تھا کہ:

''نہ صرف حسن و عشق بلکہ زندگی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ آج کے شاعر کے ہاتھ میں ایک الجھے ہوئے دھاگے کی طرح ہے۔ جسے وہ سلجھانا چاہتا ہے۔''

لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ علمی دھماکے اور ہمہ گیر ترقی و خوشحالی کے ساتھ ہی ساتھ ہمہ جہت وحشت و دہشت اور بربریت نے تمام انسانی اقدار کو ملیامیٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس اندھیر گردی میں مثبت اور تعمیری فکر کے حامل جن تخلیق کار اور شعرائے کرام نے آندھی میں چراغ جلائے رکھنے کا عزم مصمم کر رکھا ہے ان میں ایک نام یوسف رازؔ کا بھی ہے۔

یوسف رازؔ فکری اعتبار سے مقصدی و اخلاقی اقدار کے حامل ہیں اور پیشے کے لحاظ سے معلم و مدرس، چنانچہ ان کی پوری تخلیق اور تقریباً تمام ہی اشعار میں مثبت انسانی اقدار کی پاسبانی اور مقصدی زندگی کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔ وہ روایت سے بغاوت کے قائل نہیں ہاں جدید فکری و فنی تقاضوں سے چشم پوشی بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ زبان و بیان کے اعتبار سے روز مرہ بندی کے الفاظ و محاورات کو اشعار میں نگینے کی طرح جڑنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حمد و نعت ہو یا قطعات و منظومات ہر جگہ سلیس و فصیح انداز بیان قاری کے دامن دل کو کھینچے بغیر نہیں رہتا۔ یوسف رازؔ کی شاعری کا ایک بڑا امتیاز ہے کہ انہوں نے بعض قرآنی سورتوں، آیات اور سورۂ فاتحہ کی ترجمانی بڑی خوبی سے دوہوں میں کی ہے۔ زیر نظر مجموعہ ''اجالوں کا سفر'' دراصل چار حصوں میں منقسم ہے:

(۱) حمد و نعت و منقبت نیز سورہ فاتحہ کی دوہوں میں ترجمانی (۲) غزلیات (۳) قطعات و

منظومات اور (۴) دو ہے (سورہ منافقون کی آیات ۹ تا ۱۱۔ایک رکوع) سورہ زلزال سے سورہ اخلاص تک کل ۹ سورتیں اور آخر میں چند سادہ دو ہے۔

یوسف رازؔ کے اس پورے مجموعہ کلام کا قاری ان کی شاعری کی مندرجہ ذیل تین بنیادی خصوصیات کو ایک ہی نظر میں پہچان سکتا ہے: اولاً بالعموم چھوٹی اور مترنم بحروں میں سادگی و سلاست بیانی دوم قرآنی فکر کے تحت معروف کی تائید اور منکر کی تردید اور سوم ہندی کے عام فہم الفاظ کا برجستہ استعمال۔

دینی و اخلاقی اقدار کے حامل تعمیر پسند شعرا و ادبا کے یہاں تقریباً بلا استثنا قنوطی کے بجائے رجائی طرز اظہار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یوسف رازؔ اپنے اطراف ہزار تاریکیوں کے باوجود اجالوں کی روشن لکیریں دیکھ ہی لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ دکھی انسانیت کو ''اجالوں کا سفر'' کے لیے آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے مجموعہ کلام کا نام بھی اس لیے یہی تجویز کیا ہے۔ اس نام کی معنویت پر شاعر نے ایک خاص انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

؎ لوگ نادان سمجھتے ہیں اسے دنیا میں جو اندھیرے میں اجالے کی کرن دیکھے ہے

مگر پرفریب اجالوں سے بچنے کا بھی یہ انداز ملاحظہ ہو۔

؎ کارواں لگا اپنا صبح کے اجالوں میں رہنما ہی شامل تھا رہزنوں کی چالوں میں

اور خود احتسابی کا یہ شاعرانہ انداز بھی کیسا اچھوتا ہے۔

؎ شیشہ دل پہ لگے داغ نہ دیکھے کوئی جو بھی دیکھے وہی اجلا ہوا تن دیکھے ہے

خود احتسابی کے اس دائرے میں آج کے ''بکاؤ فنکار'' بھی آ گئے ہیں۔ ؎

رازؔ بکنے لگے فنکار بھی بازاروں میں دام خود اپنے زمانے سے سخنور مانگے

اہل فن کا مول لگا کر جب دیکھا بازاروں نے
شوق سے اپنے آپ کو لا کر بیچ دیا فنکاروں نے

یوسف رازؔ کو اپنے تخلص کے ذو معنی اور پر معنی استعمال کا گر بھی خوب آتا ہے۔

؎ راز میخانے جو آیا سرکشوں کے ہاتھ میں
سوچ لو پھر میکدے کا حال کیا ہو جائے گا؟

اس میں شک نہیں کہ فتنہ سازوں کی "مہربانی" سے پورا ماحول زہر آلود ہو گیا ہے مگر مسلسل طوفان حوادث میں بھی جیالے چراغ جلاتے ہی رہتے ہیں۔ یوسف رازؔ کے لفظوں میں:

؎ بجھ نہ پایا نہ بجھے گا یہ چراغ حق ہے
آندھیوں! تم نے بہت زور لگا کر دیکھا

شاعر کے خیال میں حالات کی سنگینی و بے رحمی کا یہ حال ہے کہ ملت کے واعظ اور ہادی بھی اب قابل اعتبار نہیں رہے۔ کیونکہ کہ:

؎ اس کو امیر کارواں ہم کیسے مان لیں جو راہ مستقیم سے بھٹکا ہوا لگے

چنانچہ ایسے بے حوصلہ رہنماؤں کو موجیں نگل گئیں کیونکہ انہیں طوفان سے لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

ایسے وقت میں جب مکان جل رہے ہیں، ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے، بے گناہوں کو دار پر لٹکایا جا رہا ہے اور قاتلوں کو رہنما بنایا جا رہا ہے تو شاعر کا حوصلہ قابل دید ہے۔

؎ ہم بھی سینہ سپر ہو گئے کھینچ کر اب کماں دیکھئے
عزم طوفان سے لڑنے کا ہے حوصلے ہیں جواں دیکھئے

یوسف رازؔ اپنی مقصدی شاعری کو جمالیاتی پیرایۂ بیان سے سجانے کا ہنر جانتے ہیں اس لیے ان کے اشعار فکر کے ساتھ فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ مگر یہاں بھی ان

کی سادگی اور سہل ممتنع کا انداز دل کے کناروں کو چھو لیتا ہے۔

آنگن میں کیسا پیڑ لگایا ہے آپ نے　　پھل تو نہ دے ہے خار اگلتا دکھائی دے

رہ صداقت میں زخم کھانے کا ذائقہ میں نے چکھ لیا جب

تو مجھ کو اچھا لگا ہے خنجر کی دھار پر بھی زبان رکھنا

یوسف راز اپنے ماحول کی فنی عکاسی کرنے میں شتر گربگی کا شکار نہیں ہوتے۔ اطراف کے تشویشناک حالات، مفلسی، نفرت، دشمنی، منافقت، دغابازی اور وحشت و دہشت پر بھی وہ طنز و تعریض کے نشتر چلاتے ہیں تو کبھی پوری سنجیدگی سے ان کا علاج ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بجا طور پر علاج ہی کی غرض سے قرآن وسنت پر عمل آوری اور حضرت امام حسین نیز اقبال جیسی شخصیات کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان سب سے پہلے حمد و نعت کے ذریعہ بندگی رب اور اطاعت رسول کو لازم تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا حمد و نعت اور منقبت کے اشعار کو محض روایت کی حمایت سے آگے تک لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی تناظر میں قرآنی آیات کی ترجمانی دوہوں کی زبانی پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ سب صحیح ہے مگر مشہور ہے کہ "ہر بڑا اور اچھا ادب روح عصر کی پیداوار ہوتے ہوئے ماورائے عصر بھی ہوتا ہے" جس کے لیے ضروری ہے کہ فنکار اپنے عصری حصار سے نکل کے اپنے نظام اقدار کی بنیاد پر اجتہادی فکر و فن سے کام لے۔ جس میں مزید کوشش و کاوش اور خون جگر صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یوسف راز کی سلامتی فکر اور سلیقہ فن سے توقع ہے کہ ان کے مطالعہ میں اگر مزید وسعت گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی اور جدت وانج سے وہ اسی طرح کام لیتے رہے تو ان کے افق شاعری میں بلندی آئے گی اور ان کے اشعار قارئین کی فکری و فنی تسکین کا ذریعہ بنیں گے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔